بھوک کی حمایت میں

پرویز شہریار

سوانحی خاکہ

نام	: پرویز شہریار
والد کا نام	: شہاب قاضی پوری
سن پیدائش	: 10رجنوری 1964
جائے پیدائش	: جمشید پور، جھارکھنڈ، انڈیا
وطن مالوف	: شاہ آباد، آرہ، بہار، انڈیا
تعلیم	: بی اے (انگریزی آنرز)، رانچی یونیورسٹی، ایم اے (اردو) جواہر لال نہرو یونیورسٹی، (یونیورسٹی ٹاپر)، ایم فل، جے این یو، نئی دہلی، پی ایچ ڈی، دہلی یونیورسٹی، ماس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلوما، جے این یو، بک پبلشنگ کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما، دہلی یونیورسٹی۔ (گولڈ میڈلسٹ)
ملازمتیں	: نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی (1993سے) پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی (2007)
پیشہ	: ایڈیٹر (جنرل)
موجودہ سکونت	: نئی دہلی، انڈیا
تخلیقی سفر کا آغاز	: سن 1980ء اردو فکشن سے
پہلی تخلیق	: مختصر افسانہ ''چمبل کی دسویں رانی''
پہلی اشاعت	: ہفتہ وار ادبی اخبار 'پندار' پٹنہ بہار 6رستمبر 1980

بھوک کی حمایت میں

(نظموں کا مجموعہ)

پرویز شہریار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

BHOOK KI HIMAYAT MEIN

(Collection of Poems)

by

Perwaiz Shaharyar

Year of Edition 2018

ISBN 978-93-88736-24-4

₹ 250/- (Hard Bound)

₹ 150/- (Paper Back)

نام کتاب : بھوک کی حمایت میں (نظموں کا مجموعہ)

مصنف : پرویز شہریار

سنِ اشاعت : ۲۰۱۸ء

قیمت : ۲۵۰ روپے (مجلّد)

: ۱۵۰ روپے (پیپر بیک)

صفحات : ۱۶۰

تعداد : ۶۰۰

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

ن ۔ م ۔ راشد کے نام

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان، مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے

....

ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت —— اُداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں!

جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں،
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دُلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے!
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہ سوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے،
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہرِ جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے!

——— دریچے کے قریب

(ماخوز)

گفتنی

میرا نام سیّد پرویز احمد ولد شہاب قاضی پوری، قلمی نام پرویز شہریار، تاریخ پیدائش 10 رجنوری 1964 جائے پیدائش جمشید پور، وطن قاضی پور (شاہ آباد) اور موجودہ سکونت نئی دہلی ہے۔

میں نے آر۔ڈی۔ ٹاٹا ہائی اسکول سے میٹرک فرسٹ ڈویزن سے پاس کیا۔ جمشید پور کوآپریٹیو کالج (رانچی یونیورسٹی) سے آئی۔ایس۔سی ریاضی سے کی اور بی۔اے (انگریزی آنرز) کی ڈگری فرسٹ ڈویزن سے حاصل کی۔ 1991 میں ایم۔اے (اردو) کی ڈگری جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے امتیازی نمبروں سے حاصل کی اور یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔اس پر دہلی اردو اکادمی اور جواہر لال نہرو میموریل سوسائٹی، نئی دہلی نے انعام و اسناد سے نوازا۔ 1993 میں میرے تحقیقی مقالہ ''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور'' پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے مجھے ایم۔فل کی ڈگری تفویض کی۔اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے میرے تحقیقی مقالہ ''راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی ادب کا تنقیدی مطالعہ'' پر مجھے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔

میں نے پروفیشنل تعلیم کے صیغے میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے خطاطی کا ڈپلوما 1986 میں حاصل کیا تھا۔ ماس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلوما مجھے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے 1991 میں ملا۔ میں نے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اِن بک پبلیشنگ (اسپشلائزیشن ان ایڈیٹنگ) کا دو سالہ کورس 1995 میں دہلی یونیورسٹی سے پاس کیا، یونیورسٹی میں اول مقام حاصل کیا اور دہلی یونیورسٹی نے میرے تحقیقی

مقالہ ''اردو لیزر ٹائپ سیٹنگ: اِٹس پرابلمز اینڈ چیلنجز اِن بک پبلیشنگ انڈسٹری اِن انڈیا'' پر مجھے گولڈ مڈلسٹ کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو) کی حیثیت سے 1993 میں اپنا کیریئر شروع کیا اور 1997 سے انچارج اردو کی حیثیت سے پبلی کیشن ڈویژن میں خدمت انجام دیتا رہا ہوں۔ اب تک اردو اور انگریزی زبان کی ایک ہزار سے زائد پہلی سے بارھویں جماعت کی نصابی اور معاون درسی کتابوں، بی ایڈ اور بی ای ایل ایڈ کی کتابوں، ریسرچ مونوگراف نیز پریکٹیکل مینوئل کی ادارت کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ، میں نے این سی ای آر ٹی کی نصابی کتابوں اور معاون درسی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں کئی ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو پر مستزاد، میری ان خدمات کے پیش نظر مجھے ترقی دے کر دسمبر 2005 میں ایڈیٹر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

2 رجنوری 2007 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ لیکن قومی کونسل کے سابق سربراہ اپنے وعدے کے مطابق کسی مصلحت کی بناء پر شرط پوری کرنے سے جب قاصر نظر آئے تو میں نے کونسل کو انتہائی بردباری کے ساتھ الوداع کہہ دیا۔ فی الحال، میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں ایڈیٹر جنرل کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

میں نے اپنی نوجوانی میں پہلا افسانہ 1980 میں لکھا جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا، یہ افسانہ ''پندار'' پٹنہ کے 6 رستمبر 1980 کے شمارے میں ''چمبل کی دسویں رانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح، میرے ادبی سفر کا آغاز 1980 سے ہوتا ہے۔ آغاز سفر میں جدیدیت کے رجحان سے بھی اثرات قبول کیے اور چند ایک علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ ''قوس'' کے ایک خصوصی شمارہ ''نیا افسانہ، کچھ نئے نام'' میں مختصر تعارف کے ساتھ ایک علامتی افسانہ ''نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'' کے عنوان سے 1985 میں شائع ہوا۔ 1986 میں ''شب خون'' میں ''سایہ سایہ جنگل'' شائع ہوا تو شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ پرویز شہریار جمشید پور کے نئے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن جلد ہی افسانے میں کہانی پن، بیانیہ اور حقیقت نگاری کی فوقیت کے ادراک اور شعور سے واپسی کہانی کی پرانی ڈگر پر ہوگئی۔

تعلیم کے سلسلہ میں دلّی آنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے کچھ افسانے نشر ہوئے مثلاً ''پھول کا بوجھ'' اور اسی قبیل کے دیگر افسانے۔ ''بھولپن'' یعقوب عامر صاحب نے ''یوجنا'' جیسے معاشی اور ترقیاتی رسالے میں شائع کر دیا۔ غرضیکہ ادبی اور نیم ادبی رسائل میں افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''شاعر'' اور ''کتاب نما'' میں میری کچھ نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے مؤقر رسائل و جرائد مثلاً 'مباحثہ'، 'انشاء'، 'نیا ورق'، 'فکر و تحقیق'، 'آجکل'، 'ایوان اردو'، 'اردو دنیا'، 'نیا دور'، 'جدید ادب'، 'زبان و ادب'، 'پہچان'، 'خرمن'، 'فنون'، 'الحمرا'، 'اجرا'، 'چہار سو'، 'ادب لطیف'، 'روشنائی'، 'ارژنگ'، 'عکاس انٹرنیشنل'، 'آبشار ادب'، 'عالمی ادب اردو'، 'ثالث'، 'سبق اردو'، 'اسباق'، 'روح ادب'، 'فروغ ادب'، 'پرواز ادب'، 'بزم ادب'، 'مژگان'، 'فکر و تحریر'، 'تحریر نو'، 'اسالیب'، 'عالمی سہارا'، 'بزم سہارا'، 'آمد'، 'نگینہ'، 'اخبار اردو'، 'تدریس نامہ'، 'سخنور'، 'جہاں نما'، 'گل بوٹے'، 'ستارے'، 'بچوں کی دُنیا'، 'پھول'، 'امید سحر'، 'حاشیہ'، 'دربھنگہ ٹائمز' اور 'عالمی میراث' وغیرہ میں میرے افسانے، نظمیں اور علمی و ادبی مضامین شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

ادبی نشستوں میں بھی افسانے سُناتا رہا ہوں۔ ''ادارہ بزم'' جمشید پور کی نشستوں میں ''سایہ سایہ جنگل'' اور ''کفن چور'' اور اسی قسم کے دیگر افسانے اور نثری نظمیں بھی پڑھتا رہا ہوں۔ ایسی ادبی محفلوں میں میری نظموں کے ڈکشن اور خاص طور سے امیجری کو بہت پسند کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن مجھے بذاتِ خود اپنی نظموں میں مستعمل تلمیحات پر بڑا ناز ہے۔ بچپن سے ہی قرآن کی تلاوت اور کبرسنی میں اس کے عمیق مطالعے اور انبیائے کرام کی حیاتِ مبارکہ سے بے پناہ رغبت نے جہاں ایک طرف ذات و کائنات اور فلسفۂ حیات کی موشگافیوں میں میری دلچسپی بڑھا دی وہیں دوسری طرف میری نظموں میں اظہارِ ذات اور تفکرِ کائنات کا وسیلہ بھی بنتی رہی ہیں۔ مجھے اسلامی اساطیر کے علاوہ ہندوستانی دیومالاؤں سے بھی تخلیقی قوت حاصل ہوتی رہی ہے۔

میرا اولیں افسانوی مجموعہ ''بڑے شہر کا خواب'' جس میں میرے 23 افسانے شامل ہیں، جنوری 2006 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے دہلی اردو اکادمی نے مالی تعاون فراہم کیا تھا۔ میری اس تخلیقی کاوش کا ادبی حلقوں میں بہت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

میری اولیں تنقیدی و تحقیقی کتاب ''منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور'' 2009 میں قومی کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہوئی اور کرناٹک اردو اکادمی نے اس کی تھوک خریداری کر کے جنوبی ہند کی سبھی لائبریریوں کے لیے مفت تقسیم کرا کے مالی معاونت فراہم کی۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر اب اس کا نیا ایڈیشن عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ اس کے لیے میں کرناٹک اردو اکادمی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

میری نظموں کا اولیں مجموعہ ''بڑا شہر اور تنہا آدمی'' شائع ہوا تو اس پر اتر پردیش اردو اکادمی نے 2011 میں توصیف و انعام سے مجھے سرفراز کیا۔ میں اتر پردیش اردو اکادمی کا بھی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ اس مجموعے میں میری 52 نظمیں شامل ہیں جو ملک اور بیرونِ ممالک میں گاہے بگاہے منظرِ عام پر آکے داد و تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔

میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں'' مارچ 2014 میں منظرِ عام پر آیا تو اردو کے افسانوی ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی عالمی پیمانے پر خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب پر مجھے بہار اردو اکادمی سے توصیف و انعام سے نوازہ گیا۔ اس کے لیے میں بہار اردو اکادمی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میری دوسری تحقیقی و تنقیدی کتاب ''راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری'' 2016 میں شائع ہوئی اور اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ طلبا ایڈیشن کی بہت پذیرائی ہوئی، کیونکہ یہ کئی یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ لائبریری ایڈیشن کی اشاعت کو اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام کا مستحق قرار دے کر مزید حوصلہ افزا عمل سے سرفراز کیا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب بہت قلیل عرصے میں ہی اس کی تقریباً ساری کاپیاں فروخت ہو گئیں۔

مجھے یاد ہے، جب میں ٹاٹا کمپنی جمشید پور کے کاشی ڈیہہ مڈل اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے، میں اپنے اسکول کے احاطے میں دیر سے آنے والے لڑکوں کے ذریعے صفائی کروا رہا تھا تبھی مجھے فرش پر کسی اردو کی کتاب کا ایک ورق ملا اس ورق پر کسی کہانی کا آخری حصہ چھپا ہوا تھا اور کہانی کے اختتام میں لکھا تھا۔ پریم چند یہ دیکھ کے میں تحیر زدہ رہ گیا۔ مجھے استعجاب ہوا اور میں نے اُس صفحے پر چھپی کہانی کا وہ حصہ پڑھ ڈالا۔ یہ پریم چند کی مشہورِ زمانہ کہانی ''عیدگاہ'' تھی۔ میرے معصوم دل سے ایک دُعا نکلی۔ کاش! ایسی کہانیاں میں بھی لکھ پاتا۔ میرا نام بھی روشن ہوتا۔ لوگ مجھے اپنے شہر، اپنے صوبے اور اپنے ملک میں جانتے

پہچانتے، میری شہرت، دور دور تک پہنچتی۔ کہتے ہیں کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

یہ احساس اتنا شدید تھا کہ ساتویں کلاس میں آتے آتے میں نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کہانیاں لکھ کر اُنھیں کسی الماری کے ریک پر کتابوں کے بیچ چُھپا دیا کرتا تھا لیکن ایک دفعہ میری کاپی میری بہنوں کے ہاتھ لگ گئی۔ ایک شام جب میں کھیل کوُد کر گھر واپس آیا تو میری اُس کہانی کے واقعات اور حادثات سُنا کر بہنیں مجھے چھیڑنے لگیں۔ مجھے اس قدر عار محسوس ہوئی کہ میرا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اب سب کو پتہ چل گیا تھا کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اور اُس کہانی میں حقیقی واقعات میں نے لکھ دیئے تھے۔ کچھ واقعات ہماری غربت سے متعلق بھی تھے۔ کچھ دوستوں کے ساتھ پڑوس کے باغیچے سے امرود اور آم کی میٹھی کیریاں چوری کرنے کے واقعات کا بھی ذکر تھا۔ پاور ہاؤس کے اندر بیٹھ کے امرود اور دوسرے موسمی پھلوں کی ڈھیریاں بنائی جاتیں اور سب سے کہا جاتا کہ جنھیں جو پسند ہو اُس کے حساب سے اپنی اپنی ڈھیریاں اُٹھالو۔ اس طرح کے لڑکپن کے شرارت بھرے واقعات پر مبنی کہانیاں جب بہنوں کے ہاتھ لگتیں تو وہ سب مجھے چھیڑتیں اور میں شرم سے سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن ایک فتح مندی کا بھی احساس ہوتا کہ میں نے جو محسوس کیا اور جو کچھ لکھا ہے، اُن کہانیوں کے توسط سے میری باتیں سبھی تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا ترسیل وابلاغ نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی۔ جو آگے چل کر میرے تخلیقی سفر کے دوران مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا میں جو بھی چیز موجود ہے، اس کے ہونے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور ہے۔ گھاس کی پتی سے لے کر کہکشاں کے دودھیا غبار تک کوئی بھی شئے بلاوجہ وجود میں نہیں آئی ہے۔ اس کے ہونے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ کہانی، قصے یا شعروشاعری کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ مقصد جتنا مقبولِ عام اور اعلیٰ ہوگا، فن پارہ بھی اتنا ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ادیب کا اپنا کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سبھی اُس کے نظریے سے اتفاق کریں۔ لہٰذا، تخلیق کار کا اس کی تخلیق میں مضمر نظریہ جتنا زیادہ قابلِ قبول ہوگا، اس کی تخلیق بھی اتنی ہی مؤثر ہوگی اور قارئین کے بڑے حلقے کو اپنے دائرۂ اثر میں محصور کرے گی۔

ادیب اور شاعر سماج کے بہت ہی حساس افراد ہوتے ہیں۔ اُن کے اندر اپنے جیسے دوسرے افراد کی بہ نسبت عصری آگہی، سماجی بصیرت اور نفسیاتی شعور جیسی صفات کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی حادثے کو دیکھ کر جہاں عام لوگ بے حسی سے گزر جاتے ہیں، وہاں ادیب ایک دم سے ٹھہر جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے درد اور کرب کو اَن دیکھا نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے سینے میں بہت حساس دل ہوتا ہے جو دوسروں کے رنج و غم سے دکھی اور دوسروں کی فرحت و مسرت اور شادمانی سے خوش ہو اُٹھتا ہے۔ ایسے شاعر اور ادیب ہی اپنے معاصر تخلیقی رویے اور ادبی رجحان کے ساتھ متداول سماج کے آئینہ دار اور تہذیبی و ثقافتی وراثت کے سچے ترجمان ہو سکتے ہیں۔

ادیب اور شاعر اپنے معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ وہ جس سماج میں اور جس دور میں جی رہے ہوتے ہیں، ان کے فن پارے میں اُس دور کے سماج کی دھڑکن سنائی دینی چاہیے۔ ان کے فن پارے میں واقعات اور بشری محاکات بعید از امکان نہیں ہونے چاہیے۔ ان کے کردار کی حرکات و سکنات سے اس معاشرے کی تہذیب کی جھلک مترشح ہونی چاہیے۔ کسی شاہکار فن پارے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا ادبی دستاویز تو ہوتا ہی ہے، لیکن اس میں آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے امکانات بھی مخفی ہوتے ہیں۔

ادبی سرگرمی میں قارئین کا بھی انتہائی اہم کردار ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادبی سرگرمی قاری کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، خواہ ادیب کتنا بڑا بقراط کیوں نہ ہو، جب تک ادیب، ادب اور قاری کا مثلث مکمل نہیں ہو جاتا، ادب کا مقصد ادھورا رہتا ہے۔ اس لیے سنجیدہ قاری کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ ادبی کارکردگی کی کامیابی قارئین کی بازرسی پر موقوف ہوتی ہے۔ ایک با شعور ادیب اپنے قارئین کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میرے سنجیدہ قارئین ہی میرے سب سے اہم ناقد رہے ہیں۔ اپنی تخلیقات کا سب سے پہلا قاری میں خود ہوتا ہوں اور سب سے پہلے میں ہی اس پر نکتہ چینی کرتا ہوں۔ دوسرے ناقد ہمارے رسائل کے مدیران ہیں۔ اس کے بعد باری آتی ہے عام قارئین کی جو میرے لیے سب سے خاص ہیں۔ اصل، ناقد کا نمبر سب سے بعد میں آتا ہے۔

ادیبوں اور شاعروں پر عمرانیاتی نظام کے تحت کچھ ذمہ داریاں بھی عاید ہوتی ہیں۔ ادیب جس سماج کا پروردہ ہوتا ہے، اس کا اسے اخلاقی قرض بھی اُتارنا ہوتا ہے۔ جس طرح نقاد اپنے فرائض منصبی کو بروئے کار لا کر ادیب اور شاعر کو گمراہ ہونے سے بچاتے ہیں۔ اسی طرح شاعر اور ادیب پر بھی واجب

ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے شائقین کو ابتذال وانحطاط سے بچائے۔
مجھے یہ بات پسند آئی اور میں نے سوچا کہ موضوعاتی شاعری کی طرف رجوع کیا جائے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے انیسویں صدی میں مغربی ادب سے متاثر ہو کے اردو میں جدید موضوعاتی نظموں کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت انھوں نے معاشرتی نقائص کے سد باب کے لیے بذاتِ خود نظمیں لکھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ن۔م۔راشد، میرا جی اور آگے چل کے اختر الایمان اور فیض احمد فیض کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کے بعد نظم نگار شعراء کا پورا قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان سب کے علاوہ، میں شہریار کا اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی بہت بڑا پرستار رہا ہوں۔
میں نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل سے ہی یہ محسوس کیا کہ، آپ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب تب ہی کر پاتے ہیں جب آپ ان کی ذہنی سطح پر جا کر ان کی زبان میں اور ان ہی کے انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے قاریٔ ہدف کے پسندیدہ اور دلچسپ اسلوب میں ابلاغ کے موٴثر وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ، میں نے نثری نظم کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر اختیار کیا اور میری اولیں نظمیں 1980 میں کولکاتا سے 'اخبارِ مشرق' میں شائع ہوئیں، جن کے عنوانات تھے، 'آدم اور حوا'، 'انتظار کے دوش پر' اور 'سن باتھ' وغیرہ ایسی نظمیں تھیں جو میرے نوجوان ادیب دوستوں میں بہت پسند کی گئیں۔ میرے لیے یہ بہت ہی امید افزا اور حوصلہ افزا مرحلہ ثابت ہوا، جس کی روشنی نے میرے آگے کے سفر کو آسان کر دیا۔
میں نے اپنے ادبی سفر کے آغاز سے ہی افسانے اور نظمیں دونوں میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی جو میرے آیندہ ادبی سفر میں محبوب ترین مشغلہ ثابت ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ افسانے یا نظم کے لیے میں نے پہلے سے کوئی ارادہ نہیں کیا بلکہ تازہ خیال نے خود بخود اپنا فارمیٹ اختیار کر لیا ہے۔ تخلیق کی طوالت کا انحصار بھی خیال پر موقوف ہوتا ہے۔
غزل سے بھی رغبت رہی ہے۔ لیکن، نظمیہ شاعری مجھے زیادہ عزیز رہی ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت میری نظموں کا یہ دوسرا مجموعہ ''بھوک کی حمایت میں'' سر دست حاضر ہے۔ اس میں 45 ایسی نظمیں ہیں جو ہندو پاک کے معیاری رسائل میں گاہے بگاہے شائع ہوتی رہی ہیں اور اب انھیں کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اسے ادب کے سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر صادق صاحب کا بے حد ممنون ہوں جن کی مشفقانہ رہنمائی میں مجھے اپنی علمی لیاقتوں میں اضافہ کرنے کے متواتر مواقع ملتے رہے ہیں۔

میرے استادِ اولیں پروفیسر سیّد نثار مصطفیٰ مرحوم (مصنف: راجندر سنگھ بیدی فن اور شخصیت) اور استادِ معنوی پروفیسر منظر کاظمی (مصنف: لکشمن ریکھا) کے حق میں دست بدعا ہوں کہ اللہ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند کرے۔ میرے افسانوی کائنات کی تسخیر کے شعور کو ان کی رہنمائیوں نے جلا بخشا ہے۔ آپ اساتذہ کرام کی مشفقانہ اور مدبرانہ سرپرستیاں ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی ہیں۔ ان کی یادوں کی روشنی سے میرا جہانِ فن آج بھی روشن ہے۔ میرے عزیز دوست مناظر حسن کے والد محترم پروفیسر سید احمد شمیم صاحب سے بھی اکتسابِ علم و ادب کرتا رہا ہوں۔ لہٰذا، ان کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ انہیں اچھی صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

میرے والد مرحوم شہاب قاضی پوری کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی شفقت اور محبت ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں اور ان سے مجھے علم و ادب کی روشنی ملتی رہی ہے۔ میں اپنے مرحوم والدین کے حق میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

علاوہ ازیں، اپنی گرہست زندگی کی سب سے اہم ترین شخصیت میری رفیقۂ حیات زینت شہر یار اور میرے دونوں بیٹوں انشا اور اعیان کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اپنے گھریلو فرائض سے اتنی فراغت فراہم کی ہے کہ میں اردو زبان و ادب کی مقدور بھر خدمت انجام دے سکوں۔ اللہ انھیں ہر لمحہ کامیابی و کامرانی سے سرفراز کرے، آمین!

پرویز شہریار

فلیٹ نمبر 4/48، این سی ای آرٹی کیمپس

شری اروندو مارگ، نئی دہلی۔110016

فہرست

◆◆◆

بھوک کی حمایت میں

بھوک تو بھوک ہے
بالائے ناف ہو
یا زیر ناف
بھوک لگتی ہے تو
آدمی مچل جاتا ہے
بھوک مارکسی ہو
یا فرائیڈی
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے

شجرِ ممنوعہ تک سے

گریز نہیں کرتا ہے انسان

باغِ بہشت کے مکینوں کو

اسی پاداش میں

زمین کے سینے پر اُتار دیا گیا تھا، ایک دن

عرش سے فرش پر آنے کے بعد

اُن کے اعضائے جنس

عیاں ہو گئے تھے

تو گویا

بالائے ناف بھوک نے

زیرِ ناف بھوک کو

ایک کبھی نہ ختم ہونے والے

رشتے میں

کر دیا تھا مربوط

تب سے آج تک

گندم سے آسودہ ہوتے ہی آدمی

ناف کی نشیبی وادیوں میں

اتر جاتا ہے

محوِ سفر ہو جاتا ہے

تاکہ
دُنیا کے سب سے اولیں انسانی جوڑے
آدم اور حوا سے
خود کو جوڑ سکے
سکوت موت کی علامت ہے اگر
تو اس علامت کو جامد ہونے سے بچائے
اس سکوت کو توڑ سکے
چشم حیواں میں غوطہ زن ہو جائے
بادبانِ کشتی نصب کرے
اپنی حمایت میں
ہوا کا رخ موڑ سکے

بھوک تو بھوک ہے
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے
اپنے پرائے کا فرق بھی نہیں کر پاتا ہے انساں
ایک بے چہرہ سی لڑکی کی خاطر
قابیل نے کر دیا تھا ہابیل کا خون

تب سے آج تک
اِس دھرتی کی چھاتی پر
آدمی بہاتا ہے خون
اِس کے تحت ُالشعور میں
دراصل، موجود ہے، آج بھی
آدمی کی وہی جبلی بھوک
آدمی کا وہی ازلی جنون

بھوک تو بھوک ہے
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے

◆ ◆ ◆

شجرِ ممنوعہ سے پرے

تجھ سے بچھڑ کے
اے بی بی حوا
ہم تیرے بچّے
بشری سمندر کے
پے در پے تھپیڑوں سے
دؤ راور بھی دؤ رہو گئے ہیں
بھیڑ میں کھو گئے ہیں
تمھارے ہمارے
درمیاں تھا جو حرف شیریں کا قصہ

وہ درد آشنا لمحہ، وہ ممتا سے لبریز رشتہ
اُس رشتے کی ڈور سے بندھے
ہم خلاؤں میں ہچکولے کھا رہے ہیں
پتنگوں کی مانند
ننھے بچّے کے ہاتھوں سے جوں
چھوٹ جائے

غبّاروں کی ڈور
اور بکھر جائیں جیسے
آسماں کی ناپید بلندیوں میں سبھی
ہم بھی،

اُن ہی غبّاروں کی طرح
اے بی بی حوا
تجھ سے بچھڑ کے
بھٹکتے رہے ہیں
ہر لمحہ اِس اُلجھتی بھول بھلیوں سی دُنیا میں
جی رہے ہیں
کسی طور
تیری ممتا کی چاہ میں، آس لگائے
شاید

خُدا کو
ہم پر بھی کبھی ترس آ جائے
اور ...
ناف کے اِس اُلجھے ہوئے رشتے کا سرا
دوبارہ کہیں جا کے پھر تجھ سے مل جائے
شاید
پھر کوئی دُنیا
کن فیکوُن سے
خلق ہو جائے!
جہاں باغِ بہشت کے مکیں ہوں
اور ہم ہوں
جہاں ابلیس کا نہ ہو گزر
جہاں شیطان کا نہ ڈر ہو
جہاں امن و آشتی ہو تمام!
اے کاش!
اپنا بھی ایسا گھر ہو
شجر ممنوعہ سے پرے

گردش

گردش ہے تو غم ہے
غم سے ذات ہے
غم ہی سے کائنات ہے
کہتے ہیں، ہر کرّہ اپنی گردش میں ہے
سورج بھی کرّہ، ریت کا ذرہ بھی کرّہ
کرّہ حیاتین، خلیے میں موجود مرکزہ بھی کرّہ
اور خلیہ بذاتِ خود؟
حیات کی اکائی ہے
خلیوں سے بنتی ہے خون کی ساخت

اور خون
نسوں کے جال میں مقید
ہر وقت زیست کی گردش میں ہے
خون کی گردش سے ہے دل کی دھڑکن
دھڑکنوں سے بپا ہے دماغ میں شور

دماغ ہی دیتا ہے بازوئے انساں کو زور
دماغ سے ہے ساری بصیرت، سارا شعور
اور بصیرت بذاتِ خود؟
ایک سوچ اور احساس ہے
معنویت کی تلاش ہے

سوچتا ہوں ———
نسوں کا مایا جال اگر نہ ہوتا
تو انسان کیسا ہوتا ہے،
انسانی آبادی اگر نہ ہوتی تو یہ زمین کیسی ہوتی
بادل، پانی اور برق اگر نہ ہوتے،
ہوا اور روشنی اگر نہ ہوتی تو
یہ آسمان کیسا ہوتا

حیوانات، نباتات اور جمادات اگر نہ ہوتے تو
یہ کائنات کیسی ہوتی
سورج، چاند، ستارے اگر نہ ہوتے تو
یہ نظامِ شمسی کیسا ہوتا
یہ نظامِ شمسی اگر نہ ہوتا تو
کہکشاں کیسی ہوتی

یہ ایک کہکشاں اگر نہ ہوتی تو
لاکھوں کروڑوں کہکشائیں کیسی ہوتیں؟

سوچتا ہوں ——
میں اگر نہ ہوتا تو
فکر کی یہ لامکاں وسعتیں کیسی ہوتیں
یہ آتی جاتی سانسیں
خوابیں دیکھنے والی آنکھیں
روح
یہ سب کس کا پرتو ہیں، آخر
یہ اگر اسباب ہیں تو
مسبب الاسباب کون ہے؟

عاقبت کیا ہے؟
یہ عاقبت اگر نہ ہوتی
تو میدان حشر کیسا ہوتا
میدان حشر اگر نہ ہوتا تو
انصاف کیسا ہوتا
انصاف اگر نہ ہوتا تو
جنت کیسی ہوتی

جنت اگر نہ ہوتی تو
دوزخ کیسا ہوتا
دوزخ اگر نہ ہوتا تو
ابلیس کیسا ہوتا
یہ ابلیس اگر نہ ہوتا تو
فرشتے کیسے ہوتے
فرشتے اگر نہ ہوتے تو
خدا کیسا ہوتا
خدا اگر نہ ہوتا تو
میں کیسا ہوتا؟
سوچتا ہوں ——

ذات سے کائنات کے اس سفر میں
پہلے مرغی ہے یا پہلے انڈا؟

سوچتا ہوں ——

زیست اور موت کے درمیان
ایک ذرّے کی اوقات کیا ہے
ایک پنڈولم کے ماسوا؟
نیوٹن کے کلیہ کے مطابق

کوئی بھی چیز اس وقت تک گردش کرتی رہتی ہے
جب تک کہ خارجی عوامل، اس پر اثر انداز ہو کر،
اس کی حرکت کو سکون میں نہ بدل دیں
وہ کون ہے جو سب کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے
یہ قوتِ ثقل کیا ہے؟
حرکت ہی دراصل زندگی ہے!
یہ حرکت اگر نہ ہوتی تو
زندگی کیسی ہوتی؟

سوچتا ہوں اور مسلسل سوچتا ہوں ——

یہ حرکت،
یہ گردشِ لیل و نہار کیا ہے؟
آخر، اس گردش کا کوئی اُور چھور بھی ہے،
کوئی سرا ہے؟
مانا کہ گردش ہے تو غم ہے!
لیکن، اے ہمدمو!
اس غم کا کوئی مداوا، کوئی حل ہے؟
کوئی خاتمہ بھی ہے؟

◆◆◆

صندل کی خوشبو اور سانپ

کوئی افعی ہے،
جو چندن کے پیڑ کی خوشبو سے مخمور ہوا اُٹھتا ہے
اس کی شاخوں، اس کے پتّوں سے لپٹ کر
نہ جانے کیا ڈھونڈتا رہتا ہے
جیسے چاند کی تاک میں ہر دم چکور رہتا ہے
جیسے چاند کی گھات میں کوئی میگھ کا کالا چور رہتا ہے
... ... اور پھر ایک پل ایسا بھی آتا ہے،
جب وہ چاند کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہے
دُنیا کی نگاہوں سے بچا کر اپنی آغوش میں ڈھانپ لیتا ہے،

سفیدی ظلمت میں حل ہو جاتی ہے،
روشنی تاریکی میں بدل جاتی ہے
لیکن ــــــ
یہ تاریکی ہی اصلاً تخلیق کا منبع ہے
من کا افعی بھی

رہنا چاہتا ہے
تیرے گرد و پیش
گو تری زلف کوئی شنکر کی جٹا بھی نہیں،
پھر کیوں یہ افعی
تیری گردن، تیرے نافِ تن میں حمائل ہونا چاہتا ہے؟

بار بار!
تیرے صندل بدن کی خوشبو ــــــ
کوئی امرت، کوئی سوم رس بھی نہیں،
پھر کیوں یہ دُشٹ راہو کیتو کی طرح
پینا چاہتا ہے اسے بوند بوند، چال بازی سے
تاریکی ہی تیرا مقدر ٹھہرا،
تیرا مسکن بھی تاریک ہے
اے ذوالقرنین!
ظلمت ہی تو آبِ حیات کا سرچشمہ ہے

تیرا سکون، تیرا قرار بھی تاریک ہے
تاریکی ہی اصل منبعِ نور ہے
تخلیقِ کائنات کا شعور ہے
بادل جب چھٹتا ہے،
چاند اور بھی دمکتا ہے،
میگھ دوت کے کالے گھنے حلقے سے نکل کر
چاند اور بھی دودھیا ــــــ پُرنور ــــــ ہو جاتا ہے
صندل کے شجر سے لپٹ کے سانپ... ..
اور بھی مسرور ہو جاتا ہے!
لاشعور سے شعور کا سفر ختم ہو جاتا ہے!!

◆◆◆

خواهش ہے

خواہش ہے
تری آنکھ سے
اِک دن گذر کر کے دیکھوں
ایسے زاویے پر ایستادہ ہو جاؤں
تو ہی دکھائی دے مجھے
نظریں جدھر کر کے دیکھوں
بن جاؤں مچلتے ہوئے ارماں
ترے سینے میں
اور تری پلکوں میں کچھ پل مری جاں

ٹھہر کر کے دیکھوں

ارادہ ہے
تری جھیل سی آنکھوں میں اِک دن
اُتر کر کے دیکھوں

سوچتا ہوں
تری پاکیزہ آنکھوں کے آئینے میں
اپنے تمام عیبوں کو ہنر کر کے دیکھوں
تیرے آنسوؤں سے
کبھی اپنا دامن تر کر کے دیکھوں

دعا ہے میری
تو اُس مقام کو پہنچے
کہ تری آنکھوں میں دیکھنے کو
میں اپنی نظریں بلند کر کے دیکھوں
اے کاش!
تری سیپ آنکھوں میں
اپنے لہو کو گوہر کر کے دیکھوں
شاید کہ استقرار آ جائے مجھ کو
تری آنکھوں کے تل کو اپنا گھر کر کے دیکھوں
جی چاہتا ہے

تری آنکھ کو دلہن اور ترے پلکوں کی چلمنوں کو
سیم و زر کر کے دیکھوں
فرطِ جذبات میں
کبھی یوں بھی خیال آیا
تری کافر اداؤں پہ مر کر کے دیکھوں
تری شوخ نگاہوں کو
اپنا مستقر کر کے دیکھوں
تاراج کر دوں ترے سنگھاسنِ دل کو
تری آنکھوں کی مستی کو در بہ در کر کے دیکھوں
خواہش ہے
تری آنکھ سے
اِک دن گذر کر کے دیکھوں

◆ ◆ ◆

بڑا شہر اور تنہا آدمی

دسمبر کا مہینہ اور دلّی کی سردی
تا حد نظر آسماں کا سیاہ آنچل پھیلا ہوا
اسی آسمان کے ایک سنسان گوشے میں
ستاروں کی جھلملاتی جھرمٹ سے پرے
پونم کا ٹھٹھرتا ہوا کوئی چاند جیسے
بادلوں میں کھاتا ہے متواتر ہچکولے، ہولے ہولے
----- تنہا مسافر
اور دور تک کہرے کی چادر میں لپٹی
بل کھاتی سڑکیں

دھند کے غبار میں کھویا ہوا انڈیا گیٹ
ٹھنڈ میں ٹھوکریں کھاتا مسافر
خوش نصیب ہے!
بادلوں میں گھس جاتا ہے چاند
میری کرسمس کی رونقیں پھیلی ہیں تمام
ستاروں سے روشن سجے دھجے بازار
لذیذ کھانوں کی خوشبوئیں، جہاں پھیلی ہیں ہر سو
بازار کی گرم فضاؤں میں مے کی سرمستی ہے
اسی سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے شہر کا پورا شباب
تنہا مسافر کی
چندروزہ مسافت بھی
کیا شے ہے، یارو!
ہم وطنوں سے دور
اپنوں سے دور
جمنا تٹ پر جیسے بن مانجھی کے، ناؤ
بوٹ کلب کے سرد پانی میں جیسے
تیرتا رُکتا سا کوئی حباب
وہ دیکھو فلک پہ
ثریا کے جھرمٹ سے ستارہ کوئی ٹوٹا

اپنوں سے بچھڑنے کے آتش غم میں پھنکا
گرتے ہی فلک سے
خاکستر ہوگیا ہے!
تنہا مسافر سوچتا ہے
کوئی ہے جو اس کا ہاتھ تھام لے، ہولے ہولے
کوئی ہے جو اُس کے ساتھ کچھ دور چلے،
ہولے ہولے!!

دھند میں کھوئی ہوئی منزلیں
طویل سڑکیں
اور تنہا مسافر
جیسے پونم کا ٹھٹھرتا ہوا کوئی چاند
بادلوں میں کھاتا ہے متواتر ہچکولے،
ہولے ہولے!!

◆◆◆

ناخدا کوئی نہیں

میرے سفینۂ حیات کا ناخدا کوئی نہیں
آبِ سمندر کے بہاؤ پر چھوڑ دی ہے
کشتیِ تقدیر میں نے
مجھ کو ایقان ہے
سطحِ آبِ سمندر پر
بادبانِ سفینہ کھول دی ہے میں نے
مجھ کو اپنے وجود کا گماں تھا کبھی
نہ فنا ہونے کا ہے خوف کوئی
کیونکہ

منزلِ مقصود پر پہنچائے گا مولا میرا
جس نے پہلے سے ہی
لوحِ محفوظ میں لکھ دی ہے تقدیر میری
مجھ کو فکرِ زیاں ہو بھی تو ہو کیوں کر
مجھ میں طمع ہے دہر کا
نہ کوئی جاہ و حشم کا لالچ ہے
موج در موج بہتے ہوئی
میری کشتی جہاں پہنچے گی
وہی ہوگا ساحل میرا
مجھ کو خوفِ زمانہ ہو کیوں کر
جبکہ
دستِ صبا کو سونپ دیا ہے میں نے پتوار اپنا
اور سفینۂ حیات کا
ناخدا ہے
خدا میرا
مجھ کو کوئی طوفان ڈرا سکتا ہے
اور نہ کسی بھنور میں ہے مجھ کو ڈوبنے کا ڈر
کیونکہ میرا ایمان ہے
کہ مجھ بچالے گا مشکل کشا میرا

بڑے شہر کا خواب

بڑا شہر بڑا شہر، بڑا شہر بڑا شہر
کسی کے لیے تو باعثِ طمانیت
کسی کے لیے تو سامانِ مسرت
اور کسی کے لیے ہے تو، قہر سراسر
بڑے شہر کی چاہ میں، جانے کتنے تباہ ہوئے
کتنے روٹھے اپنوں سے
کتنے چھوٹے ہم وطنوں سے

لمحہ لمحہ اُلجھتے رہے

سچے جھوٹے سپنوں سے

بڑے شہر کا خواب لیے، ہر پل نیا عذاب لیے
بھاگتے رہے تمام عمر، پیشِ نظر سراب لیے
لاحاصلی کا خواب لیے

گھوڑے کے آگے گھاس ہو جیسے
ہر سانس نئی آس ہو جیسے
جینے کی اُمنگ میں
مرتے رہے، مرتے رہے
جنت پاؤں کی چھوڑ کے، ٹھنڈک گاؤں کی چھوڑ کے
روح جلتی رہی تمام عمر، بدن کی چتاہ میں
زندگی عذاب لیے
بڑے شہر کا خواب لیے
جلتے رہے، تپتے رہے، بڑے بننے کے فراق میں
شارٹ کٹ لیتے رہے
راتوں رات، امیر بننے کی تاک میں
ہم چلتے رہے، چلتے رہے
بڑے شہر کی چاہ میں، جانے کیسے کیسے گناہ کیے
یہاں تک کہ آنکھیں ہماری پتھرا گئیں، پاؤں ہمارے شل ہوئے
انسانیت ہم سے چھن گئی، ہم درندوں کے مثل ہوئے

خوشیوں کی تلاش میں، ہم جیتے جی لاش ہوئے
اس قدر بے حس و بدحواس ہوئے، ہم خود سے ہی اُداس ہوئے
بڑا شہر بڑا شہر، بڑا شہر بڑا شہر
بے ایمانیوں کی ڈگر، بدعنوانیوں کا نگر
سچ ہے تیری چاہ میں، جانے کتنے تباہ ہوئے
سارا گاؤں اپنوں سے خالی ہوگیا
ماتمی فضا میں، اب ہر طرف حسرت و یاس ہے
پھر بھی بڑے شہر کی پیاس ہے کہ کبھی بجھتی نہیں
ایک خلقت ہے کہ کبھی رکتی نہیں!
ایک ہجرت ہے کہ کبھی رکتی نہیں!
زندگی کسی سے ہار جائے، یہ کبھی ممکن نہیں
زندگی کسی سے مات کھائے، یہ بھی اب ممکن نہیں
زندگی رکتی نہیں!!
زندگی جھکتی نہیں!!

ہیں وہ خواب میں ہنوز...

وہ نصف صدی پہلے
گھر چھوڑ کے چلے تھے
دو قومیت کا پرچم
ہاتھوں میں اُٹھائے
سنا ہے کہ
وہ اب تک منزل پر پہنچے نہیں ہیں
'ہیں وہ خواب میں ہنوز
جو ہیں خواب میں جاگے'
اصحابِ کہف کی مانند

جب وہ خواب سے جاگیں گے
نا جانے کتنی صدیاں بیت چکی ہوں گی
اُنھیں یقین کیسے آئے گا
کہ اُن کے سکّے اب از کار رفتہ ہو چکے ہیں
دُنیا میں اب اُن کا
کوئی طلب گار نہیں ہے
وہ مسافر کہ جو گم کردہ راہوں میں بھٹکتے رہے ہیں
سنا ہے کہ
وہ اب تک منزل پر پہنچے نہیں ہیں
بھوکے خونخوار بھیڑیوں، ریچھوں اور اژدھوں سے لڑتے لڑتے
اب خود بھی وہ درندے ہوتے جا رہے ہیں
سنا ہے کہ
وہاں خود ساختہ محافظوں سے
روئے زمیں پر اب کوئی محفوظ نہیں ہے
اقبال کا وہ تصورِ حریت
قوم کی دسترس سے دور ہوتا جا رہا ہے

وہ شاہین کہ
جسے جانا تھا

بہت آگے حدِ پرواز سے
وہ شاہین پہاڑوں کی گپھاؤں میں ڈیرہ جما کے بیٹھ گیا ہے
وہ شاہین آسمان تک پہنچنے سے پہلے ہی
'بیل سے گرے تو ببول پر اٹکے' کے بمصداق
صوبائی عصبیت
قومی انتشار اور
تفرقۂ ملّت کی بیساکھیوں پر جھول رہا ہے کب سے
انانیت کے ریچھوں اور بھیڑیوں نے
چیر پھاڑ کر اُس کے چیتھڑے کر دیئے ہیں
حسنِ بنگالہ ہو کہ جفاکش پنجاب
شرمندۂ تعبیر کر نہ سکا کوئی بھی وہ خواب
وہ خواب کہ
جس کے لیے وہ نصف صدی پہلے گھر چھوڑ کے چلے تھے
سنا ہے کہ
وہ اب تک منزل پر پہنچے نہیں ہیں
جنگلوں نے
چاروں طرف سے اُنھیں دبوچ لیا ہے
ہوا چلی ہے اب کہ کچھ ایسی
کہ شیر چیتوں کے بھی دیدے

چیل کوؤں نے نوچ لیا ہے
سنا ہے کہ
وہ اب تک منزل پر پہنچے نہیں ہیں

◆◆◆

ایک نئی دُنیا کی خواہش

اے اجنبی مخلوق
اے اجنبی دیس کے باشندے
بتا، کیا وہاں بھی
گلوبل وارمنگ کا خدشہ ہے؟
کیا وہاں بھی آلودگی کا چرچا ہے؟
کیا وہاں بھی سپر پاور کا غوغہ ہے؟
کیا وہاں بھی نیوکلیئر پاور کا غلبہ ہے؟
کیا وہاں بھی معصوم جانوں پر ہر پل منڈراتا ہیومن بم کا خطرہ ہے؟
کیا وہاں بھی چاند کا ایسا کوئی کرّہ ہے،

جہاں پالتھی مار کے بیٹھی بڑھیا مائی، اب بھی کاتتی چرخہ ہے؟
یا راہو کیتو اور اندو کا دیولوک سے، اب تک جنم جنم کا جھگڑا ہے؟
اے اجنبی دیس سے آنے والے بتا جلدی
کیا وہاں بھی جنگ و جدل ہے؟
کیا وہاں بھی دنگا ہوتا ہے؟
کیا وہاں بھی انساں بھوکا ہے؟
کیا وہاں بھی انساں ننگا ہے؟
اے دور دیس سے آنے والے بتا
کیا وہاں بھی ایشور، گوڈ اور خدا کا تنازعہ ہے؟
کیا وہاں بھی مندر مسجد اور سینے گاج ہیں،
کیا وہاں بھی فتنۂ کلیسا و کعبہ ہے؟
کیا وہاں بھی شیطان کا وسوسہ ہے؟
کیا وہاں بھی انسانیت شرمندہ ہے؟
اے اجنبی! اے نامعلوم دیس کے باشندے
یہاں ہر جا رشوت عام ہے،
یہاں ہر پیشہ بدنام ہے،
یہاں خونِ انساں سب سے ارزاں ہے،
یہاں ہستی اپنی ظلم کے آگے لرزاں ہے،
یہاں داؤ پر رہتی ہر دم عصمتِ نسواں ہے،

اے اجنبی مخلوق

اے اجنبی دیس کے باشی

بتا، کیا وہاں بھی

دُنیا میں غم ہے؟

کیا وہاں بھی بڑھاپا آتا ہے؟

کیا وہاں بھی بیماری ہوتی ہے؟

کیا وہاں بھی مفلسی آتی ہے، آدمی کے حال پر

کیا وہاں بھی کوئی نظر رکھتا ہے، دوسروں کے مال پر

کیا وہاں بھی بن مانگے موت آتی ہے؟

کیا وہاں بھی وبا پھیل جاتی ہے؟

اے اجنبی دیس سے آنے والے،

سُن ذرا غور سے

یہاں تو چکّر کال ہے،

یہاں جنگ وجدال ہے،

یہاں انسانیت پامال ہے،

یہاں ہر طرف مایا جال ہے،

جیتے جی حسد سے مر جاتے ہیں لوگ یہاں، دوسروں کی ترقی سے

یہاں اہلِ دَول ہے کوئی، کوئی نرا کنگال ہے،

یہاں موت کا سودا سہل ہے پر

زندگی ——؟
ہائے! کس قدر محال ہے!

اے اجنبی مخلوق
اے اجنبی دیس کے باشی
وہاں اگر یہ سب نہیں ہے تو
آ میری اُنگلی تھام لے، لے چل مجھے یہاں سے
اُس نئی زیست کی منزل امکاں پر جہاں
میں اپنی ایک نئی دُنیا بسا سکوں
دشتِ امکاں کو ایک نقش پا بنا سکوں

◆ ◆ ◆

اچھا لگتا ہے

اِس احساس کے ساتھ جینا
کہ ملک ہو رہا ہے ترقی یافتہ، اچھا لگتا ہے
قوم و ملت کے اتحاد کے لیے
ملا کے چلنا شانے سے شانہ، اچھا لگتا ہے
وزیر اعظم نے تعاون کے لیے
ملک کے باشندوں کو ہے پکارہ، اچھا لگتا ہے
دانش گاہیں بن رہی ہیں اب
علم و آگہی کا پھر سے گہوارہ، اچھا لگتا ہے
ای- بکس کی آمد آمد ہے ہر سو

کتابوں کی قِلّت نہ ہوگی دوبارہ، اچھا لگتا ہے
بے کسوں، ناداروں کے لیے
اب ہم بن جائیں گے سہارا، اچھا لگتا ہے
مفلسی کے دن کٹ گئے دوستو!
غربت نہ آئے گی، پھر دوبارہ، اچھا لگتا ہے
جگ بیتی میں ہو مضمر آپ بیتی
ایسا بھی ہو گر اپنا کوئی افسانہ، اچھا لگتا ہے
تنہا غزل سرائی سے ہے بہتر
آؤ مل کر گائیں خوشی کے ترانہ، اچھا لگتا ہے

◆◆◆

یہ کون سا شہر ہے

حیران ہوں!
یہ کون سا شہر ہے
میر و غالب کی دلّی، کبھی ایسی تو نہ تھی
ہر گلی ہر نکّڑ پر سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہیں یہاں
پیدا ہوتے ہی کوئی بھی سنپولہ
ڈسنے کے لیے پر تولنے لگتا ہے
جدھر دیکھیے
ہر جگہ سانپ ہی سانپ ہیں
کہیں خونی دروازے کے عقب سے

تو کہیں دھولہ کنواں کے فلائی اُودَر پر
ہر جگہ کنڈلی مارے ہوئے یہاں
ہزار ہا سانپ ایسے ہیں
جو ہر دم تیار بیٹھے ہیں
موقع ملتے ہی
وہ کسی بھی نرم و گداز بدن کو
نشانہ اپنا بنا لیتے ہیں،
اپنے زہریلے دانت گاڑنے کے لیے
جب وہ پھنپھنا کر باہر آتے ہیں
کسی بھی راہ گیر کا رستہ روکے
ایک دم
تن کے کھڑے ہو جاتے ہیں
حتیٰ کہ ـــــــ
بوڑھا ناگ بھی اب یہاں
اپنے کھنڈر میں تن کے کھڑا ہے
اُسے بھی انتظار ہے،
برسات کی اُس کالی اندھیری رات کا
جب وہ بوالہوس
اپنے کہنہ مشق دانتوں کو

کسی نرم و نازک غزالہ پر
تیز کر سکے، حملۂ خوں ریز کر سکے
اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ میں وہ بوالہوس
کوئی وارداتِ جنوں انگیز، قیامت خیز کر سکے

یا خدا !

یہ کون سا مقام ہے
کیا یہ تیرا قہر نہیں ہے
کیا یہ وہی پُرانا، شہر نہیں ہے
سوچتا ہوں
میرؔ و غالبؔ کی دلّی، کبھی ایسی تو نہ تھی

◆ ◆ ◆

یہ سفر جاری رہے...

چاند ستارے
سورج اور زمین
سب اس کے چلنے کے سبب ہی
چل رہے تھے
جب سے اس نے اپنے
دونوں پاؤں پر چلنا سیکھا تھا
تب سے وہ مسلسل
چل رہا تھا
اسے لگتا تھا

اگر اس نے چلنا بند کر دیا تو
یہ کائنات بھی تھم جائے گی

جب وہ چلا تھا
تب بھی وہ تنہا تھا
حق و باطل کی جنگ میں
آج بھی وہ تنہا ہے

نصف سے زیادہ دُنیا اسے ملنگ سمجھتی ہے
کوئی اسے دہشت گر کہتا ہے
لیکن وہ ہمہ وقت محو سفر رہتا ہے
اسے معلوم ہے کہ
یہ کائنات
اس کی جان کا صدقہ ہے
جو لوگ اس کے ساتھ تھے
انھوں نے دیکھا
دیو ہیکل ماہی بھی اسے ہضم کر نہیں پائی
بلند و بالا شعلوں کی لپٹ
اس پر ہو گئی تھی ٹھنڈی

اس نے موج در موج
متلاطم دریا میں جست لگائی جب کبھی
تب دریا نے بھی
اپنی آغوش میں پناہ دے دی
اس کی اگوائی میں باہیں پھیلا دی تھیں اپنی
وہ عظیم الشّان کشتی کا جب ناخدا بنا
تو دشت وصحرا بھی
سایہ فگن ہو گئے تھے سبھی

دختر کشاں اور غلاموں کے سوداگراں
رذیل و بردہ فروش
اس پر فقرے کستے تھے / کستے ہیں
لیکن وہ منافقین کے نرغے میں بھی
ہمیشہ ثابت قدم رہا

وہ چل رہا تھا
تو صرف اپنے اصولوں کی برکات سے
وہ اغیار سے بھی پیش آتا تھا
بہت عدل و مساوات سے

غلاموں کی آزادی کا تھا وہ علمبردار
عورت کو جنت سے بلند و بالا
اس نے ٹھہرایا

پانچ قدم وہ دن بھر میں چلتا تھا، بس
ان پانچ قدموں پر
اچھے اچھے تپسوی بھی نہ چل پائے کبھی
پاؤں متورم ہو جانے پر بھی وہ چلتا رہا —— مستانہ وار
بازارِ مصر کی نیلامی ہو
یا روم کے حکمرانوں کی غلامی
وہ تب بھی تنہا تھا
وہ اب بھی تنہا ہے
وہ چل رہا ہے
کہ دُنیا چلتی رہے
اسے لگتا تھا/لگتا ہے
جس دن وہ چلنا بند کر دے گا
یہ کائنات بھی تھم جائے گی

آؤ! ہم سب مل کے یہ دعا مانگیں

کبھی ختم نہ ہو اُس کا یہ سفر
دو پیروں کا یہ سفر
جاری رہے
بقائے انسانیت کا یہ سفر
تمام تنگ نظروں کی
سازشوں پر
بھاری رہے
یہ سفر جاری رہے

◆ ◆ ◆

فلسطینی بچے کا گیت

ماں!
مجھے پریوں کی کہانیاں
نہ سنا کہ اب میں
خواب مزید دیکھنا نہیں چاہتا
کیوں کہ خواب میں مجھے
ننھے ننھے بچوں کے
خون میں لت پت
زخمی وفگار جسموں سے اُٹھتی
چیخ وپکار سنائی دیتی ہے

میں خواب دیکھنا نہیں چاہتا

ماں!
مجھے پیاری پیاری لوریاں
گا کر مت سلا
کہ اب مجھے
کچھ اور نہیں سونا ہے
مجھے اب بیدار ہونا ہے
مجھے غازی بابا کے گھوڑے کی ٹاپوں والی
کہانیاں سنا
شہیدوں کی
دو دھاری تلواروں کی کاٹوں والی
کہانیاں سنا
کہ جس سے دشمن
خوف کھاتے تھے
میدان چھوڑ کے وہ سب کے سب
بھاگ جاتے تھے
ظلم بہت سہہ لیے ہم نے
ظلم اب اور نہ سہنا ہے
غازی بن کے جینا ہے

شہادت لے کے مرنا ہے
ماں!
مجھے پریوں کی کہانیاں
اپنی پیاری پیاری لوریاں
سنا کر مت سلا
کہ اب میں نے
عہد کر لیا ہے کہ
ظلم اب اور نہ سہنا ہے!
ظلم اب اور نہ سہنا ہے!!

◆◆◆

ایشیا جاگ ذرا

کبھی کبھی
میرے ذہن میں
یہ خیال آتا ہے کہ
حاملہ زمین
بچے جنتی رہے گی کب تک
پلک جھپکتے میں اپنے شکم سے
یہ زمیں
ہزار ہا بچے اگلتی رہے گی کب تک
سینے پہ رینگتے کلبلاتے کروڑوں بچے

ماں کی سوکھی پستانوں سے
دودھ طلب کرتے رہیں گے کب تک
منشیات کی عادی ہو چکی ---- یہ زمیں
دہن سے دھواں
اگلتی رہے گی کب تک
کاربن کی زد پر
یہ کروڑوں بچے
اپنی اُکھڑتی ہوئی سانسوں کو
سنبھالتے رہیں گے کب تک
یہ ننھے بالک
دوڑتے دوڑتے
تھک جائیں گے ---- اک دن یوں ہی
کبھی کبھی
میرے ذہن میں
یہ خیال آتا ہے کہ
کارخانوں میں بننے والی آکسیجن
ختم ہو جائے گی ----- اک دن
دھرتی پر اناج اُگانے کے لیے
کھیت باقی نہ رہ پائیں گے کہیں -----

اس سے پہلے کہ آبادی کا راکھشش بیدار ہو جائے
اور دھرتی کے آنچل سے بندھا سارا اناج کھا جائے

ذرا سوچو!

اس سے پہلے کہ
پُرش اور پراکرتی کا سنتولن بگڑ جائے

اس سے پہلے کہ
گلوبل وارمنگ اپنی چال چل جائے

اس سے پہلے کہ
قدرت کی ساری برف پگھل جائے

اس سے پہلے کہ
سارا عالم غرقاب ہو جائے
ہمیں کچھ کرنا ہوگا

ذرا سوچو!

سارا مغرب گلوبل وارمنگ کو رو رہا ہے
اِدھر پورا کا پورا ایشیا غفلت کی نیند سو رہا ہے
کبھی کبھی

میرے ذہن میں

یہ خیال آتا ہے کہ
ہمیں کچھ نہ کچھ اقدام کرنا ہوگا

ہمیں قبل از وقت انتظام کرنا ہوگا
ہاں! ایشیا کو ہی
بڑھ کر یہ کام کرنا ہوگا
تمام ذمہ داریوں کو اپنے نام کرنا ہوگا
اس سے پہلے کہ
بہت دیر ہو جائے
اس سے پہلے کہ
انسان شیاطین سے زیر ہو جائے
اس سے پہلے کہ
نیوکلیئر ڈیل میں
دُنیا راکھ کا ڈھیر ہو جائے
اس سے پہلے کہ
اس زمیں کا آسماں سے بیر ہو جائے
اس سے پہلے کہ
یاجوج ماجوج اپنا کام کر جائیں
اس سے پہلے کہ
آسماں کے بے ضمیر ستارے
دھرتی پر زیست کا کام تمام کر جائیں
ذرا سوچ،

اے بنی نوع آدم!
تجھے اپنے آرام کو تجنا ہوگا
کرۂ ارض پر زندگی کی بقا کی خاطر
حفظ ماتقدم کے طور پر
دجال سے بھی لڑنا ہوگا
روحانیت کے ارتقا کی خاطر
باشندگان ایشیا کو
اپنے نفس سے لڑنا ہوگا!
ہاں! ایشیا کو
آگے بڑھنا ہوگا!!

◆◆◆

تعاقب اپنے ہمزاد کا

چھوڑ آیا ہوں میں اپنا چھوٹا سا گھر
تعاقب کرتا ہے وہ اب میرا عمر بھر
جنگل کنارے، پربتوں کے تلے
ہری بھری وادیوں میں
جہاں بہتے تھے برساتی پرنالے
چھوڑ آیا ہوں میں اپنا چھوٹا سا گھر
حدِ نگاہ تک وہ خوشنما منظر
بادلوں کی اُوٹ سے پہاڑی نظارے
بجلی کی چمک، بادل کی گرج

کبھی گھنگھور گھٹائیں، کبھی بارش کی پھواریں
کبھی چھت ٹپکتی تھی تو کبھی ہلتی تھیں دیواریں

کتاب کا پیوں کو سینے میں چھپانا
سرد ہوا کے جھونکوں سے چراغ کا ٹمٹمانا

وہ تیرا معصوم چہرہ
وہ تیرا بھیگی پلکوں سے مسکرانا

وہ آزمائش کی کالی راتیں، وہ امتحانوں کا ڈر

چھوڑ آیا ہوں میں اپنا چھوٹا سا گھر

حافظے میں دفن ہے جس کا اب بھی وہ منظر

مٹ میلی سی تھیں جس کی دیواریں

سرخ تھا جس کا چھپّر

جنگلے کی کمزور سلاخوں سے

آنکھوں میں آنسو لیے

ایک لڑکا — دیکھا کرتا تھا

قومی شاہراہ کا منظر

جہاں سے دیوانہ وار بسوں اور ٹرکوں کا کارواں

بھاگتا دوڑتا رہتا تھا بڑے شہروں کی سمت

ہاں! بڑے شہروں کی سمت
جن کی خود لاپتہ تھی سمتیں!!

آج چالیس سال بعد وہ لڑکا سوچتا ہے
بڑا شہر سراب ہے، سنہری ہرن کا خواب ہے
بڑے شہر کی چاہ میں دوڑتے دوڑتے
وہ بے سمت، بے منظر، بے گھر ہو گیا ہے
لیکن — پھر کبھی کبھی اسے احساس ہوتا ہے
اس کی بھی اپنی اساس ہے
اس کا سہانا منظر اس کے پاس ہے
اس کا بھی اپنا گھر ہے
وہ چھوٹا سا گھر وہ مٹ میلی دیواریں،
وہ سرخ چھپّر
جہاں آشنا نگاہیں
جہاں محبت آمیز باہیں
آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہیں

وہ اس شہر کو چھوڑ کر اک دن وہاں چلا جائے گا!
وہاں سے پھر کبھی کہیں بھی نہیں جائے گا!!

کتنے راون

ہر سال دسہرے میں
لاکھوں راون جلانے پر بھی
بچ نکلتے ہیں
نا جانے کتنے راون
ان کی سنکھیا بھی
راہو کیتو کی طرح بڑھتی ہی جاتی ہے

اب کے راون
اور تب کے راون میں

فرق صرف اتنا ہے
اُس راون کے دس سر تھے
اِن کے ہوتا ہے ایک ہی سر
پر خرافات.....؟
اِن میں ہوتی ہیں، دس سروں سے بھی زیادہ

آسام ہو کہ بنگال
ذرا دیر نہیں لگتی اِنھیں
کسی مینکا یا اُروشی کو
سیتا سی ساوتری کو دروپدی بنانے میں

اب بھلا
اِس کل یگ میں
کون اُتارے گا، اوپر سے
اِن کے لیے کپڑوں کی تھان!
آج کل کی لڑکیاں
راون سے زیادہ
اپنے ہی کپڑوں سے ہیں پریشان!!

تشکیک

(تجسس کی جننی)

وہ اِسی خاک سے اُٹھا تھا
مرغولہ بن کے
روشنی پر سوار
آفاق پر گیا تھا
وہ دانا
کہ جسے فرشتوں نے نکار دیا تھا
کتنا نادان تھا وہ
ہم جولی سے قربت کا احساس
کتنا خوش رہتا تھا وہ

معنویت کی تلاش میں
سانپ کے پھن جیسے
دانہ گندم چکھنے کی پاداش میں
مرغولۂ خاک
گناہ کی آلائشوں سے
کتنا گراں بار ہوا
پھر خاک پر آ کر گرا
کتنا نافرمان تھا وہ
کفِ تاسف ملتے ملتے
کتنی صدیاں بیت گئیں
ندی نالے سمندر بنائے
اپنی آبِ چشمِ تر سے
آنسوؤں کے دریا بہائے
لیکن ------
گناہ اس کے
یہ سب کچھ بھی نہ دھو پائے
ہم سفرِ حیات نے
حوصلے بڑھائے
خون کی ندی

آگ کا دریا

انسانی آبادی کا متواتر انتقال
روشنیوں کے لگاتار حملے
دُوریاں بڑھتی گئیں
فاصلوں میں اضافہ ہوا
ہم نشیں کی آستین میں سانپ تھا
آج وہ گھوڑا بنا
گندم کا بوجھ پیٹھ پر اُٹھائے
سانپ کی طرح پھنکارتا ہے، بھاگتا ہے
او خدایا!
کتنا طویل رستہ ہے
ہم سفر کے زیرِ پا
کرّۂ ماہِ تمام
بہر ساعت گردش میں ہے
اور اس نے آج اٹھایا ہے سوال
بول! میری تشکیک
(تجسس کی جننی)
بڑی ہے یا تیرا یقین

مکان

(اپنے مہربان دوست پیغام آفاقی کی موت پر لکھی گئی نظم)

مکان
انسان کی ازلی ضرورت
سر چھپانے کے لیے
آدی کال کا قند مول کھانے والا مُنش
گپھاؤں میں جا کر سو جاتا تھا
اسے حاصل ہو جاتا تھا اطمینان

مکان
وہ محفوظ و ماموں جگہ
جہاں بے فکری سے قیام کر سکے انسان

اسی ایک چھوٹی سی خواہش کی خاطر
تمام عرصۂ حیات
دُنیا سے نبرد آزما رہتا ہے انسان
سر کے اوپر چھت
اور پاؤں کے نیچے زمین کی تلاش میں
تمام عمر سرگرداں رہتا ہے
آج کا انسان

میرے دوست نے بھی
تخلیق کیا تھا ایک ''مکان''
انسان کی ازلی ضرورت

لیکن،
ابدی مکان ——
محفوظ و مامون جگہ
ہماری منتظر رہتی ہے
روزِ اوّل سے ہی
ہماری منتظر ہے

روزِ ازل سے ہی
ہماری آخری آرام گاہ!
جہاں مٹی مٹی کے سپرد ہو جاتی ہے، ایک دن
شش جہت
چاروں طرف دیوار
فرش اور چھت
سب مٹی
جہاں کوئی روزن نہیں ہے
کوئی غرفہ نہیں
کھڑکی کا انحصار
روشن دان کا دارومدار
ہمارے اپنے اعمال پر موقوف ہے
یہ مکان اپنی فطرت میں
نہ نوری ہے نہ ناری ہے
جنت اس روزن کی ہم سے ہے
دوزخ اس روزن کا ہم سے ہے

کاش!
میرے مہربان دوست

پیغام آفاقی کے مکان میں بھی
ایک ایسی ہی کھڑکی ہوتی
جس کے پٹ
باغِ بہشت کی طرف کھلتے!!
آؤ یارو!
ہم سب مل کے یہ دعا کریں
غرفۂ جنت کی ٹھنڈی ہوائیں
اس کی لحد پر چلا کریں

◆ ◆

مٹی کی عورت

وہ حاملینِ پسلیاں جو آدمی کے کنکھال کو ناؤ بنا کر کھینا چاہتی ہیں
آج بادِ مخالف کے برعکس امواجِ حوادث کے خلاف، اپنے مفاد میں
تو اس میں کیا ہے بھلا ان کا قصور
دیرینہ تنہائی سے جو اچانک
گھبرا گئے تھے حضرتِ آدم
بس اسی بات کا ہے سارا فسانہ اسی کا ہے سارا فتور

پسلیٔ آدم سے جب نمو پذیر ہوا تھا گوشت پوشت کی عورت کا وجود
اسی وجودِ زن سے پڑا تھا

شیاطین میں رن
حتیٰ کہ
گندم کھا لینے کی پاداش میں
باغِ بہشت کے مکیں آ گئے تھے زیرِ فلک بروئے زمیں
اور پھر حضرتِ آدم ثمرِ شجرِ ممنوعہ چکھ لینے کے سبب توبہ کرتے رہے
تمام عمر اور بہاتے رہے اپنے درد بھرے اشکِ انفعال

فضا اب جو بدلی ہے تو
ان ہی حاملینِ پسلیوں نے گندم کی ترغیب کو بھول کے مساوی حق
کا اُٹھایا ہے سوال
تو اس میں کیا ہے بھلا ان کا قصور
دیرینہ تنہائی سے جو اچانک
گھبرا گئے تھے حضرتِ آدم
بس اسی بات کا ہے سارا فسانہ اسی کا ہے سارا فتور

فیصلہ!
تب بھی آدمی کے ہاتھ میں تھا
فیصلہ اب بھی ہے
آدمی کے ہاتھ میں

آیا پرستش کرے اسی ذات کی یا حقوق مساویانہ دے
جسے چاہے بڑھ کے اپنا لے
ایک طرف، نرم گرم مٹی کی عورت ہے!
تو دوسری طرف ہے، سراپا نور
جنت کی حور!!

◆ ◆

قصّہ تیری چاہت کا

تم اپنی ڈگر
میں اپنی ڈگر
اب جانے بھی دو
اب جانے بھی دو
تم نے جب 'نہ' ٹھان لیا ہے
میں نے بھی اب مان لیا ہے
کیا کرنے ہیں شکوے گلے
تمھارا وجود اپنا ہے
میرا کیا ہے!

حسرتیں میری اپنی ہیں
اپنا میرا سپنا ہے
شاخِ گل سے کلیاں توڑنے کی خواہش
رسیلے پھلوں سے رس
نچوڑنے کی خواہش
خواہش اندر خواہش ہیں
—— خول در خول
پیاز کے چھلکوں کی طرح
خواہشات تو لامحدود ہیں
ہاں! البتہ
انسانی وسائل ہیں قلیل
مختصر میرے بھی حدود ہیں

لیکن ——
امید کا دامن کسی نے مرتے دم تک کب چھوڑا ہے
کبھی تو یاد آئے گی میری
کبھی تو دل تیرا بھی پسیجے گا
کبھی تو تُو بھی مائل بہ کرم ہو گا
'مانا کہ تم تغافل نہ کرو گے ہرگز'

جسدِ خاک میں قوت بھی نہ ہوگی

لیکن ـــــ

یہ کلیہ ہے سارے عالم کا

آہنِ سخت نے ہمیشہ مقناطیس کا رُخ

اپنی ہی طرف موڑا ہے

ذرّاتِ آہن میں جب مچتی ہے ہل چل

منھ چوم لیتے ہیں وہ مقناطیس کا بڑھ کر

مری جاں میرا یقین کرو

روحِ شاعر بالیدہ رہے گی ہردم

قصہ تیری چاہت کا

رشتہ ہے، پیراہن و جاں کا

اک رابطہ ہے، تیر و کماں کا

جو کبھی ختم نہ ہوگا!

جو کبھی کم نہ ہوگا!!

محنت کشوں کے نام

تو مزدور ہے
یہی تیرا قصور ہے
تری قسمت میں نہیں آرام
شام کو جوں توں صبح کر
صبح کو کر تو شام
اے محنت کش
تیرا نعم البدل ہے
کام، کام اور بس کام
پیٹ کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے

روٹی کا ایندھن ہے ضروری
روٹی
گول گول
تازہ گندم کی خوشبودار روٹی
آسمان سے نہیں اُترتی من وسلویٰ کی طرح
روٹی حاصل کرنے کے لیے
مٹھی کو سِکّوں سے بھرنا ہوگا
اور سِکّوں کی دستیابی کے لیے
خون کو پسینے میں بدلنا ہوگا
رات دن کے تفرق کے بغیر
ہر پل، ہر دم جاری
جہد البقا کی جنگ میں اُترنا ہوگا
نامساعد حالات سے بھی لڑنا ہوگا
نیلے آسمان کی ردا
اپنے تن سے ہٹا
سنگی تکیے سے سر اپنا اُٹھا
فٹ پاتھ کے پتھریلے پلنگ سے تو اُٹھ
اخباروں کا پلندہ ہے جو بستر استراحت تیرا
یہ سب چھوڑ کے تو کام پر جا

زندہ رہنے کے لیے
آج موت سے بھی تجھے لڑنا ہوگا
تنے ہوئے رسے پر سر کے بل چلنا ہوگا
تو مزدور ہے
تجھے ہر کام ہی کرنا ہوگا
موت سے پہلے
تجھے آرام نہ کرنا ہوگا
پیٹ کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے
خون کو پسینے میں بدلنا ہوگا
رات دن کے تفرق کے بغیر
ہر پل، ہر دم جاری
جہد البقا کی جنگ میں اُترنا ہوگا
نا جانے کب
محنت کش ہاتھوں کی
تکریم و تعظیم کرے گی دنیا!
مکاروں و عیاروں و دغا بازوں کے ہاتھوں
کھلونا بنتی رہے گی دنیا؟؟

راجستھان کی ایک نظم

راجستھان کی شاہی حویلیوں کی
جھلملاتی شبستانوں میں
سیاحوں کو چھوڑ کے
جب لوٹتے ہیں ساربان مزدور
اپنا دن بھر کا تھکا بدن لیے، چور چور
تب باجرے کی بکھری اور لہسن کی چٹنی
بن کر ایندھن
پیٹ کی بھٹی میں اُترتی ہے
تب نیند کی ریل

بن کر بلٹ ٹرین
چھک چھک، چھک چھک، چھک چھک
ایسی طوفانی رفتار پکڑتی ہے
کہ پتہ ہی نہیں چلتا،
کب کون سا شہر گزرا
کب کون سا گاؤں آیا
کب کون سا اسٹیشن نکلا
اور کب کون سا پڑاؤ آیا

کتنی بار سرنگوں سے ٹرین نکلی
کیسی کیسی وادیوں سے گزری
پہاڑیوں کا کب چڑھاؤ آیا
کتنی بار گھاٹیوں میں اُتری
کتنے جھیلوں جھرنوں کو چھیڑتی نکلی
کب کون سا ڈھلاؤ آیا
کچھ پتہ ہی نہیں چلتا

پیٹ کی بھٹی گرم ہو تو
جیسلمیر جیسی کڑاکے کی سردی بھی

لحاف میں پسینے چھوڑنے لگتی ہے

باجرے کی بھکری
اور لہسن کی چٹنی
اپنوں کا رشتہ
اپنوں سے جوڑنے لگتی ہے
سردی کی سوتن
ٹھٹھرتی ہے ڈیوڑھی پر
کسی بھوکی ابھاگن کی طرح
ساری رات
اور .....
باجرے کی بھکری
اور لہسن کی چٹنی
سرد طویل راتوں میں
پریتم کا دل موہنے لگتی ہے

بزدل قوموں کے آقاؤں کے نام

موجودہ صدی
بزدل قوموں کے آقاؤں کی صدی ہے
گذشتہ صدی
قومیت کے عروج کی صدی تھی
جب کبھی مشکل آن پڑی
بہادر فوج
اپنی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر
میدانِ جنگ میں بڑھ چڑھ کے لڑی ہے
مگر اب کے رسم کچھ ایسی چلی ہے

گلوبلائزیشن کے نام پر
بزدل قومیں اپنی مکاری سے
سب کی آقا بنی ہیں
ہتھیاروں کے سوداگروں کی
آمدنی میں کچھ ایسی افتاد آپڑی ہے
پہلے ہالوکاسٹ
اور اب دہشت گردی کی آڑ میں
ہر طرف ایک پراکسی وار سی کھڑی ہے
میدانِ جنگ کے بجائے
اب کے نشانے پر عام شہری ہے
شاید جنگ کا نیا تصور ہو کوئی
موجودہ صدی
نفسیاتی جنگ کی بھی صدی ہے
یہی سبب ہے کہ
معصوم پھول سے بچوں، ناتواں بزرگوں
اور نازک کلیوں سی دوشیزاؤں پر
ہمہ وقت
میزائلوں کی جھڑی ہے

بادشاہت ختم ہوئی دنیا سے
اب عوام کے ایسے نمائندے کر رہے ہیں
سب پر حکومت
جن کی سات پشتوں نے کبھی
نہ میدانِ جنگ کا رخ کیا ہے
نہ کوئی جنگ لڑی ہے
سچ ہے! موجودہ صدی
بزدل قوموں کے آقاؤں کی صدی ہے

◆ ◆ ◆

گم ہو گئی ہے کوئی شئے

میرا قیاس تھا کہ
زیست کے لمحات
تیری عنبری زلفوں کے
دام میں گرفتار ہوئے بغیر بھی گزر جائیں گے
لیکن
یہ میرا واہمہ تھا
تیری یاد کسی موج در موج
حلقۂ گرداب کی مانند
الجھتی ہی رہی

تمام عمر
کبھی چین لینے ہی نہ دیا
سوچا تھا کہ
تیری چشم شیریں کے ماسوا اور بھی
پر کشش راہیں ہیں
مرمریں بانہیں ہیں
تیری مرمریں بانہوں کے سوا
لیکن یہ میرا واہمہ تھا
یادیں
تیری زلف گرہ گیر کی
ایک عرصہ بیت جانے کے بعد بھی
ڈال دیتی ہیں میرے پاؤں میں اک زنجیر سی
تھم جاتے ہیں میرے پاؤں یکلخت
کھینچ دیتا ہے کوئی
لکشمن ریکھا میری چاروں اور
نمودار ہو جاتی ہے
میری نظروں میں
کوئی پتھر کی لکیر سی
سوچا تھا

تمھارے بغیر بھی
زیست میری سنور سکتی ہے
دن چمک سکتا ہے
رات مہک سکتی ہے
لیکن یہ میرا واہمہ تھا
آج پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو
تمھاری یادوں کے پراسرار گھنے جنگل میں کھڑا تنہا
کچھ ڈھونڈ رہا ہوں ایسے جیسے
گم ہوگئی ہو کوئی شئے
کسی راہ گیر کی

◆◆◆

تخلیق کا وہ لمحہ

ہونٹوں نے
سرگوشی میں چپکے سے کچھ کہا
دل میں اِک ہلچل سی مچی
دور کیچڑ میں کوئی کنول سا کھلا
آنکھوں نے دیکھا
بھنورے نے کلیوں کو چھوا
کلیوں نے لمس کی تمازت سے آنکھیں
کھول دیں اپنی
تتلیوں نے نرم سنہری کرنوں کی گدگداہٹ سے

اپنے پنکھوں کے پٹ کھول دیئے تمام
پتنگ کوئی ہوا میں اُڑی
چرخی سے بندھی
ڈور میں کچھ تناؤ سا ہوا
حدِ نگاہ تک
آسمان کی طنابیں تن سی گئیں
بادل نے جھک کے
پہاڑیوں کی دوشیزگی کو کچھ اس طرح سے چھولیا
کل کل، چھل چھل، کل کل، چھل چھل .....
بھر بھری مٹی سے پھوٹ کر
ننھے چشمہ کا سفر
سبک ساری سے شروع ہوگیا
دیکھتے ہی دیکھتے
نیلے امبر سے
اُڑتے سفید بگلوں کا قوس معدوم ہوگیا
موسلا دھار بارش ہوئی
سب کچھ جل تھل ہوگیا
کچھ عجب تھا
تخلیق کا وہ لمحہ

سنا ہے دوٗر کہیں
دریا کے بھیتر کوئی باندھ سا ٹوٹ گیا ہے!!

◆ ◆ ◆

بس اِک آخری سوال ہے

اب تو نہ کوئی روشن ستارا
نہ کوئی بدر، نہ کوئی ہلال ہے
شبِ دیجور کی سیاہی پھیلی ہے تمام
زندگی لمحہ لمحہ ڈھلتی شام ہے

افق تا افق
سیاہی میں روپوش ہوتا ہوا
اِک رنگِ گلال ہے
اب کس بات کا ملال ہے

وہ رخِ زہرہ جبیں
وہ چاند کا ٹکڑا، وہ روشن ستارہ
سب ہوا ہو گئیں
اب تو بس خواب وخیال ہے

پہلو میں کوئی نازنین
نہ کروٹ میں کوئی گل بدن
نہ نگاہوں میں کوئی پری جمال ہے
زندگی کی شام ڈھلنے کو ہے
کس بات کا اب ملال ہے

زندگی تو نے اتنا کچھ دیا مجھ کو
بس اِک آخری سوال ہے
کیا یہ لازمی ہے؟
کہ ہر اِک عروج کا زوال ہے

فقط ایک نقطہ

خالقِ کائنات نے
منصبِ تخلیق میں گویا
انبساطِ اعظم کا صلہ رکھا ہے
تا کہ تخلیقِ کائنات کی جو ابتدا ہوئی تھی کبھی
وہ اپنے نقطۂ منتہا کی جانب محوِ سفر ہو کر
بغیر کسی سدِ باب، کسی رخنہ کے
ہر دم بدم پیہم گامزن رہ سکے
انبساط کے اس انتہائی نقطہ پر پہنچ کر بندہ
خالقِ کائنات کے اسی وصف سے جا ملتا ہے

جہاں کوئی بندہ رہتا ہے اور نہ کوئی بندہ نواز
اس کن فیکن کے لامتناہی سلسلۂ حیات میں
خالق نے گر لطفِ ملکوتی نہ رکھا ہوتا
تو لمحۂ گذراں میں اسفل تا اسفل ذی روح بھی
اس سفرِ وصالِ ہمہ اُوست میں
ہمراہیٔ کاروانِ وفا نہ ہوا ہوتا
شریکِ کافلۂ جہد البقا نہ ہوا ہوتا
تخلیق میں ہی مضمر ہے، دراصل
معراجِ سفر کا جوہر
معراج کہ جو ہر ذی روح کو
خالق سے ملا دیتی ہے
رازہائے تخلیقِ کائنات کا ہمراز بنا دیتی ہے
اس منصبِ تخلیق کی بدولت ہی
خالق اپنی مخلوق کو اس کے ہم نشینوں میں
سرفراز بنا دیتا ہے
کن فیکن ہی وہ حرفِ شیریں ہے کہ جو
عشقِ حقیقی کو قلبِ مومن میں جگا دیتا ہے
خالق و مخلوق و تخلیق کو پھر سے
ایک نقطے میں سما دیتا ہے

بحرِ بیکراں کے تلاطم کا راز بھی ایک نقطہ
موہوم سے شگوفے کا آغاز بھی ایک نقطہ
گیتی کے رازہائے سربستہ کا ہو اِنکشاف
یا ہو کہکشاؤں کے بکھرنے کا انداز
اس کی حقیقت ہے
فقط ایک نقطہ!

◆◆◆

ایک نظم گلزآر کے نام

(جشنِ ریختہ -III کے تناظر میں)

از دلّی تا لاہور
آج ایک ہی نام گونج رہا ہے
ادب کی فضاؤں میں
اردو کی کہکشاؤں میں
ایک ہی نام کی ہے پکار
اردو کا سپہ سالار
گلزار، گلزار، گلزار
زبانِ لشکر کی نشاۃ ثانیہ کا محرک
نئی صدی کی

ریختہ کا سردار

اردو کی خوشبو کا محافظ

اس کی رسم الخط کا علمبردار

جس کے دم سے آگئی ہے

جاں بلب

جسد اردو میں ایک نئی تازگی

جس کے دم سے آگئی ہے

گلشن اردو میں بہار

گنگا جمنی تہذیب کا امین

ہندو مسلم ایکتا کا نقیب

برِ صغیر کا سفیر

انسانی رشتوں کا پاسدار

تشکیل نو ہو

غالبؔ کی حویلی

یا ہو ذوقؔ کا تجدیدِ مزار

ہر گام پر بڑھایا ہے تو نے

اہلِ اردو کا وقار

دلّی کے اخباروں کی ہوں سرخیاں

ادبی اداروں کی سرگرمیاں

یا ہو ممبئی کا فلم سنسار
ہر جگہ جھلکتا ہے تیرا اردو سے پیار
تیرے ہی دم سے کھنچے چلے آتے ہیں لوگ
جوق در جوق

خواہ ساہتیہ اکیڈمی کا فنکشن ہو
خواہ ریختہ کا تہوار

تیرے ہی دم سے ہے
آج باغِ اردو میں بہار

◆◆◆

عاقبت کا توشہ

نہ مجھے لالچ ہے رُتبات کا
نہ مجھے خوف ہے کسی بدذات کا
مجھے مال و حشم کی چاہ نہیں
کہ میں سگِ دُنیا نہیں
خدا کے در کے سوا
میرا سر کہیں جھکتا نہیں
میرا سر قلم ہو سکتا تو ہے لیکن -------
میرا سر خم ہو سکتا نہیں!
نہ حرص و ہوس سے مجھے کوئی کام ہے

نہ میر جعفر میرا نام ہے
میرے دوست مجھے غلط سمجھ نہ لینا
میں اس دور کا نہیں انسان ہوں
میں جھوٹ کبھی نہ بول سکا
میں اس لیے بدنام ہوں
تمہاری اس میں کوئی خطا نہیں
کذب وریا کی مجھ میں ادا نہیں
بس میرا یہی قصور ہے
میری ذات دؤ راز فتور ہے
میں بندر بانٹ میں شریک کبھی رہ نہ سکا
میں غلط کو صحیح کبھی کہہ نہ سکا
یہی سبب ہے
کہ پانی میں ہوں
لیکن مگرمچھوں سے مجھے بیر ہے
یہی میری عاقبت کا توشہ ہے
اسی میں میری عافیت
اسی میں میری خیر ہے

ایک نظم امیر خسروؔ کے نام
(قومی کونسل، جشن یوم اردو کے تناظر میں)

خسروؔ تیری شان نرالی
خسروؔ تیری جا ہے عالی
تو نے بھکتی کی نئی راہ نکالی
سماع، محفل، دف، قوالی
نظام الدین اولیا کا درباری
بن تیرے، در پر نہ جائے سوالی
جو کوئی چاہنے والا
درِ شیخ المشائخ میں جھولی پھیلائے
تیرے توسط سے کبھی نہ جائے خالی

راگ راگنی سب تیرے باندی
موسیقی، رقص سب تیرے غلام
کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں
تیرے آگے، سب مانگے پانی
تونے جینے کی نئی ڈھب نکالی
نجا مودین سے نیناں ملائی کے
قرار دل کا چھینا نیناں ملائی کے
گنگا جمنی تہذیب کا امین خسرو
ہندو مسلم ایکتا کا نقیب خسرو
اے طوطیِ ہند
تونے زبانِ ہندوی کی بنیاد ہے ڈالی
ہم سب ہیں تیرے آج ابھاری
تیرے ہی دم سے زندہ ہے
تیرے ہی دم سے تابندہ ہے
آج اردو زباں ہماری
خسرو تیری شان نرالی
خسرو تیری جا ہے عالی

محبت کے بیکراں سفر میں

عورت تیرے کتنے روپ، تیرے کتنے نام
محبت کے اس بیکراں سفر میں
— کتنے پڑاؤ، کتنے مقام
کبھی کلی، کبھی پھول اور کبھی مرجھائی ہوئی پنکھڑی
کبھی انار، کبھی ماہتاب اور کبھی پھلجھڑی
تخلیق کا منبع، شکتی کا خزینہ تیری ذات
محورِ لامتناہی سلسلۂ حیات و ممات
شفقت، محبت، ایثار و وفا سب تیرے روپ
سیتا، ساوتری، رادھا، میرا

سچی چاہت کے نقوش

ایک فقط چاہت کا عطیہ، تیرا یہ ہیرے کا روپ
عورت میں ہو گر خود اعتمادی

دوشاسن درو پدی کی سواگت کو آئے
بھیروں خود شیراں والی کی عفت بچائے
عورت ہی حاصل تخلیق دُنیا ہے
عورت ہی شعورِ آدم کا پیش خیمہ ہے
خدا نے جو بخشا ہے تجھے نسوں کا جال
عجب اس کی قدرت ہے عجب اس کا کمال
کہیں مینکا تو کہیں مریم ہے تو
کہیں اولاد کی جویا زوجہؑ ذکریا ہے تو
انجیل وقرآن سب تیرے رطب اللسان
کہ تو ہی اصل میں ہے دھرتی کی شان
ممتا کرؤ نا تیرے نام
اے ماں! تجھے سلام
آغوش مادر کو یوں پہلا مکتب ٹھہرایا
کہ تو نے ہی آدم کو محبت کرنا سیکھایا
جس نے دل میں تیرے
سبھوں کی محبت رکھی

اسی نے قدموں میں تیرے جنت رکھی
عقل آدمی آج اتنی کیوں حیران ہے
توہی آدمی کی پہلی پہچان ہے
تیرے ہی دم سے رنگ و بوئے کائنات
ازازل تا ابد آدم کی تو ہے شریکِ حیات
سبھوں کا تجھ پر یہ اعتبار ہے
شجرِ حیات کا توہی برگ و بار ہے
یہ دُنیا بھی تجھ ہی سے نمودار ہے
گرہست جیون کا آشرم ہے تجھ سے تابندہ
توہی بنی پھر آدم کی نجات دہندہ
توہی جنت کی پہلی حقدار ہے
ساری عبادت پرستش کی ہے تو روحِ رواں
اے عورت ایسا تیرا روشن کردار ہے
محبت کے اس بیکراں سفر میں ...

◆◆◆

بنتِ حوا سے خطاب

تمہارے پیڑ بدن پر
نئی نئی کونپلیں جو ابھر رہی ہیں ابھی
تمہاری لچیلی شاخہائے شجر پر
ننھی ننھی کلیاں جو آہستگی سے آنکھیں کھول رہی ہیں ابھی
تمہارے نشیب و فرازوں پر
تنوں کے مخصوص زاویوں پر
کنوارے بدن کے جو پھول کھل رہے ہیں ابھی
تمہیں خبر نہیں کہ
تمہارے ان نازک اندام پر

جلدوں کی ہزاروں لاکھوں مسام پر
خوشبوؤں کی لپٹیں جو بھر رہی ہیں ابھی
تمہارے گرد و پیش کی فضائیں
اس کی تپش سے لہک رہی ہیں
تمہارے گلاب رخساروں پہ
برگ و بار جو نمودار ہو رہے ہیں اور
اس پر جو اک چاندنی سی پسر رہی ہے ابھی
وہ شام رنگ بھنوروں کو دیوانہ
سرخ مائل بلبلوں کو مستانہ
چاک گریباں عاشقوں کو عارفانہ کر رہی ہیں سبھی
تمہارے ناف تن کی کستوری میں
وہ کشش ہے
کہ جس کے گرداگرد اپنی اپنی مدار پر
ان گنت رشی منی
صدیوں سے تپسیہ کر رہے ہیں اور
صوفی و سنت ایک ہو کے عالم میں
اپنی اپنی نفس اور اندریوں سے
برابر امجاہدہ کر رہے ہیں سبھی
تمہیں خبر نہیں کہ

یہ سورج

یہ چاند ستارے یہ ثریا یہ کہکشاں

تیری ہی ذات سے ہیں وابستہ سبھی

کائناتی نظام کا ایک بھی ذرّہ

نہیں تیری الفت سے ہے مبرّیٰ

تو ہی اس اقلیم حیات کی ہے روحِ رواں

تیرے ہی دم سے یہ جہانِ رنگ و بو ہے روشن روشن

تیرے ہی دم سے چلتا ہے یہ کاروبار گلشن

گھورے کی پستی سے تا اوجِ ثریا

چار دانگ عالم میں ہے تیرا ہی چرچا

تجھے خبر نہیں کہ

تیرے ہی دم سے

یہ دنیا ہے سرسبز و شاداب و شاداں

تیرے ہی دم سے یہ لگتی ہے

ہم سب کو جنت نشاں

◆ ◆

حاصل سیر جہاں

دل ہے کہ
اب بھی اُلجھا ہوا ہے
محبوب کے خیالوں میں
بدن کے فسوں سے نکلے
تو روح تک پہنچے
سالکِ خوش فکر
اب بھی الجھا ہوا ہے
چشم و بینی، ساعدِ سیمیں اور ریشمی گالوں میں
حاصلِ سیر جہاں، میرے دوستو!

صرف اتنا ہے کہ
تسخیرِ کائنات کا ایک ادھورا خواب
حلقۂ چشم میں
سرگرداں رہتا ہے، اب بھی
دل ہے کہ اُلجھا رہتا ہے
سنسار کے ان ہی مایا جالوں میں
ایک طرف حسین پیکروں کا آتشی ہجوم
جوانی کا تموج اور شوخیاں و رنگینیاں تمام
حدِ نگاہ تک مچلتی بلکھاتی دوشیزۂ حیات کے
ہشت پہلو جلوے ہیں
دوسری طرف، روح فرسا دینے والی حقیقت
ایک نامعلوم منزل سے کم ہوتے ہوئے
فاصلے کا مسلسل احساسِ گراں
آنسوؤں کا سیلاب
خس و خاشاک سا سطحِ آب پر تیرتا ہوا وجود
جسمِ ناتواں —— اچانک ڈوبنے لگتا ہے
دعائے نیم شب کے نالوں میں

تاہم دل ہے کہ

جسے گرم خون میں لت پت
گوشت کا ایک لوتھڑا کہیے
اب بھی اُلجھا ہوا ہے
معشوق کے دل نشیں خیالوں میں
دراصل ——
عرفانِ ذات ہی
رازِ تسخیر کائنات ہے
محبوب کے لب زینہَ اول ہیں محض
منزلِ مقصود تو ہے فنا ہی فنا
وہ ابدی لمحہ فنافی الذات ہے
جہاں سے شروع ہوتا ہے
ایک جہانِ بقا کا سفرِ لامکاں
ایک عالم ارواح کا سفرِ بیکراں
ایک کبھی نہ ختم ہونے والی محبت کا سفرِ جاویداں
میرے ہمراز
میرے رنج کے خوگر
پھر کیوں
دل اتنا اُداس ہے
تصورِ محبوب

میرے پاس ہے
حاصلِ سیرِ جہاں، میرے دوستو!
ایک خوابِ ناتمام ہے
ایک خوابِ ناتمام کے ماسوا کچھ بھی نہیں

◆ ◆ ◆

وجود کا چقماق

ناجانے کب سے
دشتِ جنوں میں بھٹک رہا ہوں
کچھ اس انہماک سے
کہ میرا سایہ ہی مجھ سے جل رہا ہے
افکار کا ایک ہجوم ہے تا حدِ نگاہ
جو میری سانسوں میں آگ بھر رہا ہے
سنگلاخ زمین
قدموں کو لہولہان کیے دیتی ہے
خاردار سخت جھاڑیاں

راہ میں حائل ہیں، اُلجھنیں پیدا کر رہی ہیں
خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے
جو مجھے غافل ہونے نہیں دیتا
اُس پہ مستزاد یہ کہ
کسی شوخ و چنچل بچے کی طرح
وقت ہے کہ
اُنگلی تھامے
آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ... ..
دوسری طرف ——
خشک درختوں کے متواتر بھرتے سلگتے شاخسانے
تنفس میں آگ بھر رہے ہیں

مجھے ڈر ہے کہ
سارا کا سارا جنگل
جل کے خاکستر ہو نہ جائے کہیں
باہر کی آگ سے تو بچالوں گا خود کو مگر ——
خدشہ ہے
اپنے اندر کی آگ سے
نہ جل جاؤں کہیں

مانا کہ
دُشمنوں کی یلغار سے
ضربِ کاری کھا کر بھی سنبھل جاؤں گا
لیکن ـــــــ
خودی کے اُس مقام پر آج میں کھڑا ہوں! شہریار
زمانے کے تیرِ نظر سے گر بچ بھی گیا
اپنی شدتِ احساس سے
وجود کے چقماق سے
جل جاؤں گا !!

◆◆◆

نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے

میرے بطون میں
دور کہیں کسی ننھے چشمے کی طرح کلبلا رہی ہے
ایک نظم ——————
کبھی ذہن کی بلند چوٹیوں سے
تو کبھی قلب کی گہری وادیوں سے
کسی کونپل کی مانند
سر اُبھارنے کو تڑپ رہی ہے ایک نظم
نئی دُنیا کی دید کی خواہش لیے
خوشی سے بیقرار ہو کے مچل رہی ہے ایک نظم

جس طرح چٹانوں کا سینہ چیر کر
کوئی جھرنا پھوٹ بہتا ہے
——— کل کل، چھل چھل، کل کل، چھل چھل
اُسی طرح میرے احساس کی بھٹی میں
جذبات اُبل رہے ہیں
بھاپ کی مانند، یہ توانا جذبات
شعور کی تمام بندشوں کو توڑ کر
مست فضا میں موجوں کے سنگ لہرانا
ہواؤں کے سنگ اُڑ جانا
بھنوروں کے سنگ اِترانا چاہتے ہیں!
جیسے کوئی آبِ جو اپنا رستہ خود تلاش لیتا ہے
نظم بھی میرے اندر سے / میرے بطون سے
طشت از بام ہُوا چاہتی ہے
اِک کہرام ہُوا چاہتی ہے
اپنے شیدائیوں میں جا کر
مقبولِ عام ہُوا چاہتی ہے
اُبلتے ہوئے چشمے کو بھلا
اپنے قدموں سے روک سکا ہے، کون؟
نظم کو بھی ———

میں بھلا کیسے روک سکتا ہوں
نظم تو سماج کی پروردہ ہے شروع سے ہی
سماج میں وہ اپنا مرتبہ چاہتی ہے
تن کے آہنی قفس میں بھلا
کب تک رہ سکتی ہے مقید
نظم تو حصارِ ذات سے کچھ سوا چاہتی ہے
نظم ایک آبِ رواں ہے
نظم ایک موجِ بلا ہے
چشمہ کو چک سے آبشار ہوا چاہتی ہے
نظم اپنے ہونے کا سبب / ہونے کی وجہ چاہتی ہے
نظم آپ تک پہنچنے کا
حوصلہ چاہتی ہے!
نظم اپنی خوبصورتی کا
صلہ چاہتی ہے!!

خدایا! ایسی کوئی تدبیر کر

خدایا! لوحِ محفوظ پر
ایسی قسمت کسی کی مت تو تحریر کر
زندگی مختصر دے
بے شک! لیکن
خودی کو کسی کی مت تو تحقیر کر
نہ کردار کا کسی کو کھوٹا بنا
نہ پستہ کسی کا تو ضمیر کر
انسانیت پامال ہو
روح بھی تڑپتی رہے

ایسی مہلک بیماریوں[1] کی، زمین پر
مت تو تکثیر کر

خدایا! لوحِ محفوظ پر
ایسی قسمت کسی کی مت تو تحریر کر

کہ انسان شرمسار ہو
اپنے آقا کے دین پر
اور خلقت بھی طعنہ زن ہو جائے
روٹھی ہوئی تقدیر پر

خدایا!
ماںتا کے رشتے کو جو
رسوا کرے سرِ بازار
ایسے فرزندوں کو —— راتوں رات
مت تو امیر کر
شاہوں کو بھی رشک ہو جس پر
سوالوں سے جو ہو بالکل بے نیاز
ایسا مجھے تو فقیر کر

خدایا! لوحِ محفوظ پر
ایسی قسمت کسی کی مت تو تحریر کر
تمام رنگوں میں جس کے گھلے ہوں غم ہی غم

صفحۂ قرطاس پر مت اتار تو نقش ایسے
مت کسی کی ایسی تو تصویر کر
ہاتھ جو دعا کو اٹھے، کبھی نہ وہ جھکے
لب جو دعا کو کھلے، کبھی نہ وہ تھکے
تقدیر بدل جائے
قوم کی جس سے
یا الٰہی! دعاؤں میں میری
ایسی تو تاثیر کر
خدایا! ایسی کوئی تدبیر کر

1؎ سرطان

◆ ◆

گوا کے ساحل پر لیٹی ہوئی دوپہر

نیلے سمندر کی آتی جاتی لہروں سے
دُھل دُھل کے نکھر جاتے ہیں
شبنمی بدن تمام
حسن کے نشیب و فرازوں سے متصل ریت کے سنہرے ذرّات
ایک دم سے چمک اُٹھتے ہیں،
جب سورج کی تپش سے
مسامِ جسم و جاں سے پگھلنے لگتی ہیں
نرم جلدوں کی چکنائیاں،
بدن کے گوشوں میں

جب سورج کی کرنیں جذب ہو جاتی ہیں گہرائی تک
تبھی نازک اندام بدیسی گوریاں لینے لگتی ہیں

اپنے السائے ہوئے بدن کو کھینچ کے انگڑائیاں

ہرے راما ہرے کرشنا کے اِس دیش میں

شام کی منتظر و متلاشی گوپیاں

ڈھونڈتی پھرتی ہیں، سمدُر منتھن کے دوران

پتامبر کے مضبوط بازوؤں کی گوپنہائیاں

اعضائے کومل تمام ثبت کرنے لگتے ہیں، اُس دم

ریت پر اپنے خدوخال کی نشانیاں

دوُر شوخ وشنگ موجوں کی طلاطم سے پرے

قطار در قطار

ناریل کے درختوں سے اُلجھ کر
آگے بڑھنے سے جھجکنے لگتی ہیں پُروائیاں

ایسے میں دِل شاعر سلگ اُٹھتا ہے

منظر منظر ساحل تا سمندر

دیدے میں اُترتے

تپتے جلتے ہوئے گدرائے بدن دیکھ کے
جہاں فضا کے آنچل میں بادِ صبا کے گداز بانہوں کا سرمئی غبار
ناریل کے درختوں کے تنے میں

متواتر بڑھتا ہوا کمان سا تناؤ
شوریدہ سر موجوں کا دامنِ ساحل پر چڑھنے کا مسلسل جنون،
سانس چڑھتی ہوئی ساعتوں کی ملگجی دھوپ چھاؤں میں
نیم عریاں دوشیزاؤں کا ہجومِ شوق میں نمائشِ جسم وجاں
جس کے دیدار سے بے قابو ہوتے ہوئے وحشی گھوڑے
ہنہنانے لگتے ہیں، ... ..
ایسے بھیگے جسم کی تاب سے جلتی لہکتی ہوئی غیر مانوس سی
دلفریب فضاؤں میں

شاعرِ رومان پرور اکثر سوچتا ہے یہ
سنبھالوں اپنے دل کو شہریار مبادا
بن نہ جائیں یہ سیر و سیاحت کہیں
نام و ناموس کے لیے سامانِ رسوائیاں

◆ ◆

خرد و جنوں کے درمیاں

توحید کا تھا مرحلہ

تو ہی تو تھا جلوہ نما

من و تو کا جب پردہ نہ تھا

ہر طرف تھا تو ہی تو

تب جسم، جاں سے علیحدہ نہ تھا

خدا سے بندہ جدا نہ تھا

تب کوئی خدا نہ تھا، کوئی بندہ نہ تھا

وجود تھا، سب لامکاں

دوئی کا کوئی شائبہ نہ تھا

وحدت الوجود کا تھا، ایک سیلِ رواں

تو نے دکھا کر خودی کا جلوہ

کر دیا سب آئینہ

ہر نفس ہر وجود میں دیکھوں

چہرہ چہرہ، اپنا اپنا

ہر حرف میں نہاں ہے

ہر حرف سے عیاں ہے

آئینہ تیرا آئینہ

خدایا خدایا!

سارا عالم ہے کیسا حیرت کدہ

سارا عالم ہے کس قدر حیرت زدہ

سارے غافل ہیں مجھ سے ملنگ

دمادم مست قلندر، دمادم مست

ہر نفس ہر وجود میں دیکھوں

چہرہ چہرہ، اپنا اپنا

جبکہ معلوم ہے کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر کیا چہرہ، پھر کیا اپنا

دم بھی تو ہمدم بھی تو دم ساز بھی تو

حرف بھی تو لفظ بھی تو ان سے بنی آواز بھی تو

تو ہی تو، فقط تو ہی تو

تجھ سے بعید نہیں کوئی گلشن رنگ و بو

ایک ہی سکّے کے ہیں دو پہلو

خرد و جنوں

ورنہ حبابوں پر رقصاں ہے، یہ عالم تمام ہوائے ہو

باقی ایک ہی ذات ہے

اللہ ہو! اللہ ہو! اللہ ہو!

◆ ◆ ◆

اللہ اکبر

کھلا ذہن

پاکیزہ تن

صادق زبان

کہاں سے لاؤں، میں ایسا انسان

دُنیا بہت بدل گئی ہے شہریار

ہر طرف ہیں قیامت کے آثار

عقیدت کے نام پر ہو رہا ہے کاروبار

سبز و سیاہ، سرخ و زعفران

چاند، ستارے، اوم اور کرپان

خدائی رشتوں کے علائم
روحانی رشتوں کے نشان
بن گئے ہیں سب دُکان
امن ومحبت کے علمبردار
صبر وتحمل کے امین
بن گئے ہیں سب ایمان فروش
اپنے ضمیر کے مجرمین
ہمارا تمہارا، ہم سب کا رب
سنتا ہے تبھی فریادیں
دل کی گہرائیوں سے
جب نکلتی ہیں دُعائیں
دُنیا جی کا جنجال سہی!
ہر عروج کو زوال سہی
زندگی گرچہ محال سہی
خدا کا یہ جلال ہے
موت سے نجات
ہرگز بھی ممکن نہیں
خدا کا یہ جمال ہے
مومن کا یہ وصال ہے

نفس کو اپنے بھول جا
تیرا یہ کشفِ کمال ہے
تجھ میں پنہاں جل وجلال ہے
ثنویت کو گر تو تیاگ دے
وحدت میں اس کی ڈوب کر
خودی کو اپنی بھول جا
فنا تیرا محال ہے، فنا تیرا محال ہے
کہ تو صاحبِ کمال ہے
صاحبِ کشف و کمال کی
زندگی ہے جاویداں، حیات لازوال ہے
موت کو تو مات دے، شہوت و خشم و طمع و غرور
ان کے نشے سے تو باہر آ ——
چھوڑ دے تو ان کا سرور
لڑ تو اپنی ذات سے، اپنے ہونے کے احساس سے
مر تو اپنے جیتے جی، امر ہو جائے گا تو ایک دن ضرور
صوفی ہر دم مست قلندر
ولی ہر دم مست قلندر
اللہ اکبر!
اللہ اکبر!!

ابلیس دُور کھڑا تماشائی ہے

ابلیس کی آدم سے جنگ جاری ہے
ابلیس آج بھی آدمیت/انسانیت پر بھاری ہے
بارگاہِ الٰہی سے راندۂ درگاہ ہونے کے بعد
ابلیس نے قسم کھائی تھی
آدمی کو گمراہ کرنے کی
اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے
اس نے اپنے انتقام کو جنگ کا نام دے دیا ہے
آدمیت کے خلاف اس کا انتقام
انسانیت کے خلاف اس کی جنگ اب بھی جاری ہے

مہذب اور ترقی یافتہ اقوام
خود سے کمتر اقوام کو بناتی ہیں اپنا غلام
ان کی عزت، ان کی عفت لگاتی ہیں داؤ پر
ان کی توانا عورتوں کو سرِ عام کرتی ہیں نیلام
جنگ ایک لعنت ہے، ایک کلنک ہے
انسانی تاریخ کے ایوان میں یہ ایک چور دروازہ ہے
تمدن کے اعلیٰ وارفع رنگ محل میں
یہ ایک ایسی ندیدہ ابلیس کی خالہ ہے، اُلٹے پیروں والی رقاصہ ہے
جو جواں سال فوجیوں کا کلیجہ نوچ کر کچا چبا جاتی ہے
انسانی کنکھالوں کی ڈھیر کو گدھوں کے حوالے کر جاتی ہے

دُنیا جب سے بنی ہے
ہزاروں لاکھوں سالوں سے
ابلیس کے انتقام کا یہ خونی رقص جاری ہے
آدمیت اور انسانیت پر ابلیس کا پلہ بھاری ہے
جنگ آدمی کا گوشت نوچ کر کھا جاتی ہے
جنگ انسان کا زخرہ پھوڑ کے خون پی جاتی ہے
جنگ ایک ایسی بھوک ہے جو کبھی مٹتی نہیں
جنگ تباہی کا شاخسانہ ہے
جنگ اموات کا پروانہ ہے

جنگ بہادری کا انعام ہے
جنگ مجبوروں کے لیے ہجرت کا پیغام ہے
جنگ میں مانا کہ لاکھ برائی ہے
لیکن جنگ میں ایک ایسی کشش ہے، دل ربائی ہے
جنگ میں روزِ ازل سے دشمن بھائی کا بھائی ہے
ابلیس نے اپنی بھی اقلیم قائم کر لی ہے، شاید!
ابلیس کی اپنی ہی خدائی ہے!!
جنگ اور امن کے تصادم میں
مانا کہ جیت امن کی ہوتی ہے
لیکن امن بہت ٹھس ہے، بے حس ہے
جنگ کا ہر کوئی شیدائی ہے، جنگجو ابلیس کا سگا بھائی ہے
یہی سبب ہے کہ
ساری دُنیا میں ابلیس ہمہ وقت جنگ کی فراق میں رہتا ہے
کیونکہ اس نے آدمیت سے، انسانیت سے انتقام کی قسم کھائی ہے
جنگ میں اصلاً دُشمن بھائی کا بھائی ہے
ابلیس تو دوٗر کھڑا محض تماشائی ہے

تم نہیں سمجھو گی

تم نہیں سمجھو گی
تم کیا جانو!
باجرے کے دانے شیشی میں جب بھرنے لگتے ہیں
بوجھل ہو کے عجب آہنگ سے وہ بجنے لگتے ہیں
اُس ساعت، مرد کی کیفیت
اُس سانپ کی سی ہو جاتی ہے
جو اپنی کینچلی اُتارنے کی خاطر
خود کو تنگ پتھریلی راہوں سے گزارتا ہے
خاردار جھاڑیوں سے اُلجھتا ہے

بدن پر جا بجا خراشیں پڑ جاتی ہیں
حتیٰ کہ جسم پر نیل کے دھبّے سے پڑنے لگتے ہیں
تب کہیں جا کے
اپنی کینچلی اُتارنے میں وہ کامیاب ہو پاتا ہے
نیم خوابیدہ نیم بیدار
حواس کے سہارے
تاریک سرنگوں سے گزرنا
جس کے اختتام پر روشنی کی کرنیں ہوں رقصاں
کتنا انبساط انگیز ہوتا ہے وہ لمحہ
کتنا جاں فزا ہوتا ہے وہ سماں
تم کیا جانو!

تنگ پتھریلی راہوں سے دیوانہ وار گزرنے کا کرب
خاردار جھاڑیوں سے مجذوبانہ اُلجھنے کا حظ
بدن پر جا بجا خراشیں پڑ جانے کا مستانہ درد
تم نہیں سمجھو گی

کہتے ہیں
مرد اور گھوڑے

کبھی ہوتے نہیں بوڑھے
گھوڑا کتنا بھی کبر سنی کو پہنچ جائے
ہنہناتا ضرور ہے
مرد بھی اپنے ہمزاد کی افزائش کا بہانہ
بناتا ضرور ہے
لیکن تم کیا جانو یہ سب!
کہتے ہیں تخریب میں ہیں پوشیدہ تعمیر کے مراحل
اماوس میں نہاں ہوتی ہیں
پورنیماشی کی منازل
تخلیق کے کرب کے بغیر ممکن نہیں
روشنی کا سفر
لیکن یہ سب تم نہیں سمجھو گی
تم کیا جانو!

◆ ◆

جسم کے انڈیکس سے پرے

جھیل جیسی آنکھیں
لعل بدخشاں ہونٹ
بل کھاتی سیاہ زلفیں
کشش چاروں کھونٹ
یہ سب بھول بھلیاں ہیں
چہرہ مہرہ
دراصل ایک پردہ ہے
منزلِ مقصود سے بھٹکانے کا ایک حربہ ہے
اصلی عورت

کہیں اور ہوتی ہے
جسم کے انڈیکس سے پرے
کنڈلی مارے بیٹھی، کسی برہمن کی طرح
غیر مرئی سی
اودے اودے بادلوں کے خواب جیسی
اَماوس کی سیاہ رات جیسی
برق خوابیدہ
اپنی توانائیوں سے بھرپور
کنڈل جگانے میں
بڑی تپسیہ کی ضرورت ہوتی ہے
'پریم' —— عورت کے اندر کا سچا موتی ہے
اُس کے جسم کے پار جا کر ہی
اُسے تلاش کیا جا سکتا ہے
ورنہ جسم کے گرداب میں رکھا کیا ہے
مرد اپنے بازوؤں کے زور پر
قابض ہونا چاہتا ہے 'عورت' کے بدن کے شور پر
لیکن ——
بدن ریت کا ٹیلہ ہے
خواہشوں کا میلہ ہے

وہاں سراب ہی سراب ہے
عورت
ظاہر میں نہیں
باطن میں ہوتی ہے کہیں پوشیدہ
اپنے ایپک سینٹر کے متلاشی
کسی جوالامکھی کی طرح
آدمی تمام عمر
بھاگتا رہتا ہے حسین چہروں کے پیچھے
اُس مردِ ناداں کی طرح
جو سمندر کی سطحِ آب پر
اُبھرتی ڈوبتی لہروں کو نہارتا رہتا ہے اکثر
اپنی پُر شوق نگاہوں سے
ساحل، سمندر پر
پڑی سیپیوں سے کھیلتا رہتا ہے دن بھر
شاید اُسے معلوم نہیں
سچّے موتی تو
سمندر کی اندرونی تہوں میں پڑے ہوتے ہیں گم صم
اُن گمنام موتیوں کو پانے کے لیے
سیپیوں کے لب کھلنے تک کرنا ہوتا ہے انتظار

عورت کے اصلی جوہر کی خاطر
جسم کے انڈیکس سے پرے
چہرے کے پُر فریب پردہ کو ہٹا کر
کسی غوطہ خور کی طرح
اُس کے نہاں خانۂ دل میں اُترنا ہوگا
روح کے بند دریچے پر متواتر دستک دینا ہوگا
عورت سامانِ تعش نہیں
بازار کا جنس نہیں
جسم بھی نہیں ہے
عورت کا اسمِ ثانی ——
محبت ہے، محبت ہے،
محبت ہی ہے!

◆ ◆ ◆

جاگو کسان جاگو!

شوریدہ سر دماغ کسی اور ہی اُلجھن میں ہے
تغزل کے پنکھ لگا کے اُڑ نہیں سکتا
کیونکہ
خیال
سماجی ذمّے داریوں
انسانی رشتوں کے عجب بندھن میں ہے
طاؤسِ قلم
ردیف اور قافیے کے گھنگرو پاؤں میں باندھ کے
کاغذ کی بساط پر ناچنے سے قاصر ہے

بحور و اوزان کے دائرہ در دائرہ حصار میں
اس کا دم گھٹتا ہے
طاؤسِ قلم
مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے، دیوانہ وار
آج تو اِس پر شیوا کے تانڈو کا آھنگ ہے طاری
ہندوستان جو کبھی کہلاتا تھا ——
'سونے کی چڑیا'
جہاں دھرتی صدیوں سے
سونے، ہیرے اور موتی اُگلا کرتی تھی
جو ازمنۂ قدیم سے ہی
کرشی پردھان دیش تھا
اُسے آج عالمی سیاست کے جبر نے
بازار واد کے قہر نے
اِس قدر کر دیا ہے مجبور
کہ آتم ہتیہ کر رہے ہیں کسان یہاں
اور بھوکے مر رہے ہیں مزدور

سربراہانِ اقتدار کی ہوس نے
کسانوں کے مسائل کی ایک عرصے سے ان دیکھی کی ہے

یہی اسباب ہیں کہ آج
ماؤوادیوں اور مارکسیوں نے مل کر
بھوکے، ننگے اور بے گھر آدی واسیوں کی ریلی کی ہے
ایوانِ اقتدار میں آج پھر کھل بلی سی ہے
جاگو کسان جاگو
اپنی اُٹھتی ہوئی پیٹ کی اِس آگ سے
قصر سلطاں کو ہلا دو
خوابیدہ حکمراں کو جگا دو
کہ ایشیا میں دورِ انقلاب کا ہو چکا ہے آغاز
سامنت وادوں اور جاگیرداروں کا جاتا رہا، اب دبدبہ
عام آدمی نے آخر چکھ لیا
انقلاب کا مزہ
بدل چکا ہے، اب انساں کا مزاج
ظلمتوں کی رات اب چھٹنے کو ہے
نئی روشنی کا ہوگا
اب ہر شے پہ راج
ہاں!
ایسے دورِ انقلاب میں، اگر
طاؤسِ قلم

ردیف اور قافیے کے گھنگرو پاؤں میں باندھ کے
کاغذ کی بساط پر ناچنے سے قاصر ہے
تو کوئی غم نہیں!

◆ ◆ ◆

دو قدم

دوقدم تم چلو
ہم چلیں دوقدم
یوں ہمارے تمھارے درمیاں
فاصلے ہوں کچھ تو کم!
دلوں میں ہمارے پیدا ہو
ایک ربطِ باہم
خوشگوار فضا ہو
بارآور ہو ذرا موسم
دوقدم تم چلو

ہم چلیں دو قدم
سرد مہری کے کچھ بادل چھٹیں
ارض و سما ہو گرم
ندیوں میں موسیقی بہے
سرحدوں کے پار بھی
محبت کے بجیں سرگم
ہوائیں بھی ہو مترنم
دو قدم تم چلو
ہم چلیں دو قدم

جو آستین کے سانپ ہیں
اُن سے نہ ہم ہراس ہوں
انھیں جتنا بھی
دودھ پلائیں ہم
بدلے میں دیں گے وہ ہمیں
زہریلا زخم
دو قدم تم چلو
ہم چلیں دو قدم
امن و آشتی کے دیپ جلائیں

اندھیروں کو دور بھگائے ہم
مستقبل ہمارا جگمگائے
نئی پود ہماری مسکرائے
آؤ چلیں
پہل کریں
کوئی ایسے گیت گائیں ہم
مانا کہ——
جہادِ زندگانی دُشوار ہے
بہت تیز تر زمانے کی رفتار ہے

لیکن——
سفینۂ ہستی پار لگانے کے لیے ہم میں سے
آج ہر کوئی تیار ہے
کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں بھی
آج تعلیم کی پتوار ہے
لاکھ بدظن ہو جائیں ہم سے
اقوام عالم
ہمیں اس کا ملال ہے
نہ ہی ہے اس کا ذرا بھی غم

ایمان گر ہمارے پاس ہے
حافظ ہمارا
پروردگار ہے
دو قدم تم چلو
ہم چلیں دو قدم
یوں ہمارے تمھارے درمیاں
فاصلے ہوں کچھ تو کم!!

◆ ◆ ◆

اولیں نظمیں : ''آدم اور حوا'' اور ''انتظار کے دوش پر''،
اخبار مشرق، کولکاتہ، مغربی بنگال، انڈیا

وجہ شہرت : افسانہ نگاری

اولیں افسانوی مجموعہ : بڑے شہر کا خواب (سن اشاعت 2005)

مشہور افسانے : شجر ممنوعہ کی چاہ میں، دس سروں والا بجوکا،
لو اِن ریلیشن سے پرے، سیلوا جڈوم کہاں جائیں،
شہر نوشیرواں کا ایک یادگار محرم

اولیں نظموں کا مجموعہ : بڑا شہر اور تنہا آدمی (سن اشاعت 2009)

مشہور نظمیں : صندل کی خوشبو اور سانپ، بھوک کی حمایت میں،
یہ سفر جاری رہے، بڑے شہر کا خواب،
شجر ممنوعہ سے پرے

تحقیقی اور تنقیدی کتابیں : منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور
(سن اشاعت 2011)
: راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری
(سن اشاعت 2017)

ثانوی نظموں کا مجموعہ : بھوک کی حمایت میں (سن اشاعت 2018)

ادب اطفال (تراجم) : 1۔ ننھا شہزادہ 2۔ معصوم دل کا جادو

ہما کو پرواز کرنے دو : (ترجمہ) اسٹیج ڈرامہ (سن اشاعت 2012)

راجندر سنگھ بیدی : حیات اور کارنامے : ریسرچ مونوگراف
قومی کاؤنسل کا پروجیکٹ (زیر تکمیل)

نغمۂ گیتی (ترجمہ) : ساہتیہ اکادمی کا پروجیکٹ (زیر تکمیل)

ثانوی افسانوی مجموعہ : شجر ممنوعہ کی چاہ میں (سن اشاعت 2014،
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

اردو فکشن کے تثلیث : منٹو، بیدی اور عصمت کا تنقیدی مطالعہ
(اشاعت کے لیے زیر غور)

خط و کتابت کا پتہ : فلیٹ نمبر 4/48، این سی ای آر ٹی کیمپس،
شری اروبندو مارگ، نئی دہلی۔ 110016 (انڈیا)

ای میل آئی ڈی : spa1962@gmail.com

موبائل فون نمبر : 09910782964

Bhook Ki Himayat Mein
(Collection of Poems)
by
Perwaiz Shaharyar
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA
ISBN 978-93-88736-24-4
978-93-88736-24-4
www.ephbooks.com